ہمدرد
نونہال



شہد

فِیہِ شِفَاءُ لِلنَّاس

اِس میں انسانوں کے لیے
شفا ہے

شہد انسان کے لیے قدرت کا ایک بیش قیمت عطیہ ہے۔ صحت قائم رکھنے اور جسمانی نشوونما کے لیے اس لطیف، زود ہضم اور مقوّی غذا کا کوئی نعم البدل نہیں۔

۴ اونس کے ٹیوب میں
پیک کیا ہوا ہمدرد کا خالص مصفّا شہد
پورے اعتماد سے استعمال کیجیے۔





ہمدرد کے ہر سیلز ڈپو، عام دکانوں
اور کیمسٹوں کے ہاں ملتا ہے

HAMDARD FRUIT PRODUCTS PAK.
HFP
LAHORE

بچّوں کے لیے ایک نعمت ہے

ہمدرد فروٹ پروڈکٹس۔ لاہور۔ کراچی

جولائی ۱۹۶۵ء

مدیر اعلا: حکیم محمد سعید

مدیر معاون: مسعود احمد برکاتی

فون: ۴۷۷۷۵

شمارہ ۷ جلد ۱۲

ہمدرد نونہال

دفتر ہمدرد نونہال
ہمدرد ڈاک خانہ، کراچی ۱۸

جاگو، جگاؤ

ہماری ہمیشہ کوشش یہی ہونی چاہیے کہ ہماری ذات دوسروں کے لیے سود مند ثابت ہو، کسی کو ہم سے نقصان نہ پہنچے۔ مصیبت کے ماروں کا ہاتھ بٹانا، ان کی مدد کو پہنچنا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔ یاد رکھیں دوسروں کو اپنے سے کم تر خیال نہیں کرنا چاہیے، بلکہ انھیں اپنے ہی جیسا سمجھنا چاہیے، اور اُن کے دُکھ سُکھ میں حصہ لینا چاہیے، دوسروں کے غم کو اپنا غم جاننا چاہیے۔ بلاشبہ یہی وہ باتیں ہیں جن کے اختیار کرنے سے ہم بلند اخلاق کہے جاسکتے ہیں، اور خود ہمیں اطمینان و طمانیت قلب حاصل ہو سکتی ہے، اور ہم ہمیشہ خوش رہ سکتے ہیں۔

حکیم محمد سعید



قیمت :— ایک رسالہ : ۷۵ پیسے —— سالانہ : آٹھ رُپے



بلبل اور مالی

اشرف صبوحی

ایک امیر آدمی کو گلاب کے پودوں کا بہت شوق تھا۔ اس نے اپنے باغ میں قسم قسم کے سیاہ سفید گلابی پھولوں کے درخت لگائے تھے۔ مالی کو تاکید تھی کہ ان کی جان سے زیادہ رکھوالی کرے۔ جب وہ کھلتے تو عجب بہار ہوتی۔ صبح نور کے تڑکے روزانہ وہ اپنی پھلواری کی سیر کو آتا۔ پھولوں کو دیکھتا اور ان کی خوشبو سونگھ کر خوش ہوتا۔

کہیں سے ایک بلبل بھی بھٹکتی بھٹکاتی اس باغ میں آگئی۔ بلبل گُل کو بہت ہی پسند کرتی ہے۔ اس نے جو چمن میں نئے نئے رنگ کے پھول کھلے ہوئے دیکھے مست ہوگئی۔ کبھی اِس شاخ سے اُس شاخ پر پھُدکتی، کبھی اِس پھول سے اُس پھول پر جاتی، چہچہاتی اور ایک ایک پھول پر صدقے قربان ہوتی۔ پیار کرنے کے لیے چونچ سے کریدتی۔ پھول نازک ہوتے ہیں، بلبل کی چونچ لگتے ہی پتیاں بکھر جاتیں۔ باغ کے مالی نے

کئی روز تک یہ تماشا دیکھا۔ پہلے تو وہ بلبل پر ترس کھاتا رہا۔ اسے اپنے دل کا ارمان نکالنے دیا، لیکن جب وہ چمن کا ناس ہی کرنے لگی تو اسے خیال ہوا۔ جہاں وہ کھلے ہوئے پھول کی ٹہنی پر بیٹھتی اڑا دیتا، مگر پھولوں کی جدائی بلبل کو کہاں بھاتی وہ اِدھر اُدھر پتّوں میں منھ چھپالیتی اور پھر پھولوں کو گلے لگانے لگتی۔ آخر تنگ آکر امیر آدمی نے مالی کو حکم دیا کہ جال لگا کر اسے پکڑلے۔

مالی حکم کا بندہ، اس نے جال لگا دیا۔ نادان بلبل پھولوں کے لالچ میں پھنس گئی۔ مالی نے غضب یہ کیا کہ بلبل کو پنجرے میں بند کرکے باغ کے ایک درخت کی ٹہنی پر لٹکا دیا۔ آزاد بلبل اب قید ہو گئی۔ پھولوں کو دیکھتی پروں کو پھڑپھڑاتی اور رہ جاتی۔ نہ دانہ کھاتی نہ پانی پیتی۔ رات دن چہچہانے کے بدلے چیخا کرتی۔ ایک دن مالی مالک کے گلدستے کے لیے پھول چنتا ہوا جو اس کے پاس سے گزرا تو وہ رونے لگی۔ مالی نے پوچھا، "پھول تو ہنس رہے ہیں اور تم رو رہی ہو، کیا بات ہے؟"

بلبل بولی، "ارے دو کوڑی کے نوکر، تو ان بھیدوں کو کیا جانے۔ اچھا، یہ تو بتا کہ مجھ دکھیا نے تیری کیا خطا کی تھی، جو تو نے پکڑ کر مجھے پنجرے میں قید کر دیا؟" مالی نے کہا، "تو نے ہمارے مالک کے چاہیتے پھولوں کو کرید کرید کر خراب کر دیا۔ کیا یہ خطا نہیں؟" بلبل نے جواب دیا، "ارے خدا سے ڈر، پھولوں کو مجھ سے زیادہ کون چاہے گا۔ اللہ کے بندے میں تو ہر وقت پھولوں کو پیار کرتی تھی۔ اگر تیرا مالک میرا دشمن بن گیا تھا۔ میرے گیت اسے بُرے معلوم ہوتے تھے تو وہ مجھے مار ڈالتا، میرا گلا گھونٹ دیتا۔ جیتے جی پھولوں کے لیے ترسنا اور پنجرے کی تیلیوں سے سر ٹکرانا مجھے مرنے سے بدتر ہے۔"

بلبل کی یہ باتیں سن کر مالی کہنے لگا، "میں اور کچھ نہیں جانتا۔ تو نے میرے مالک کا دل دکھایا۔ اس کے باغ کو اجاڑا۔ اچھے سے اچھے پھولوں پر چونچیں ماریں۔ اب اپنی سزا کو پہنچ۔ پنجرے میں قید رہ!" بلبل بولی، "گلاب کے دو چار پھولوں کو تمھارے خیال میں میں نے

خراب کیا تھا، اس کا بدلہ مجھے یہ ملا کہ قید ہوئی۔ ان میں تو کوئی جان نہ تھی۔ مجھ جان دار کو جو تم اس طرح ستا رہے ہو، خدا سے نہیں ڈرتے۔ اگر اس نے تم سے اور تمھارے آقا سے اس ظلم کا بدلہ لیا تو کہو کیا ہوگا۔"

اتنے میں باغ کا مالک بھی آگیا تھا۔ اس نے ایک درخت کی آڑ سے بلبل کی باتیں سن لیں۔ دل بھر آیا اور سامنے آکر پنجرے کی کھڑکی کھول دی۔ کھڑکی کھلتے ہی بلبل نے ایک فرّاٹا بھرا اور جس درخت پر پنجرہ لٹکا ہوا تھا اس کی پھننگ پر بیٹھ کر پہلے خوب چہچہائی، پھر باغ کے مالک سے کہنے لگی، "مہربان، آپ کی ہمدردی کا شکریہ۔ جیسا آپ نے مجھ کو قید سے آزاد کیا ہے، خدا آپ کو ہر بلا سے بچائے رکھے۔ آپ کا چمن سدا کھلتا رہے۔ مجھ مٹھی بھر پروں پر آپ نے احسان کیا ہے، میں بھی آپ کو نیکی کا بدلہ دیتی ہوں۔ دیکھیے، وہ سامنے جو دائیں ہاتھ کی طرف بڑا سا درخت ہے، اس کے نیچے اشرفیوں سے بھرے ہوئے دو مٹکے گڑے ہوئے ہیں۔ آپ کھود کر نکال لیں۔"

باغ کا مالک حیران تھا کہ بلبل یہ کیا کہہ رہی ہے۔ اسے خزانے کی کیا خبر۔ بلبل بولی، "جناب، آپ کیا سوچتے ہیں۔ جانور جھوٹ نہیں بولا کرتے۔"

باغ کے مالک نے کہا، "میں تجھے جھوٹا نہیں سمجھتا۔ تیرے کہنے کو سچ مانتا ہوں، مگر تعجب اس بات کا ہے کہ زمین کے اندر کی گڑی ہوئی چیز تو تجھے نظر آگئی اور آنکھوں کے سامنے لگا ہوا جال نہ دکھائی دیا۔ یہ بھید میں نہیں سمجھا۔"

بلبل نے ٹھنڈا سانس لے کر جواب دیا، "اس کو نہ پوچھیے۔ ان باتوں کو نہ آپ سمجھ سکتے ہیں، نہ میں سمجھا سکتی ہوں۔ بس اتنا جانیے کہ اللہ کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں۔ ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔ تقدیر ہی جب اندھا بنا دے تو کیا خاک سجھائی دے۔"

بچّوں کے شاعِر

علّامہ اِقبال



باپ: بچو! تم علامہ اقبال کو تو جانتے ہو۔ ہمارے ملک کے وہ سب سے بڑے شاعر تھے۔ اردو کے بھی اور فارسی کے بھی۔

ماں: تم ہر روز ان کی نظمیں پڑھتے اور سنتے ہو۔ مدرسوں میں، بڑی بڑی محفلوں میں، ریڈیو پر سب جگہ اُن کا کلام سُنایا جاتا ہے اور دِل کو پیارا لگتا ہے، لوگ سر دھنتے ہیں۔

باپ: شاعر تو اور بھی ہیں۔ ہر ایک کے شعروں میں بڑے مزے کی باتیں ہوتی ہیں۔ ہمارے دل کو فوراً الجھالیتی ہیں، لیکن علامہ اقبال کے کلام میں ایک خاص بات ہے، وہ ہمیں زندگی کے متعلق بعض ایسی مفید باتیں سناتے ہیں، جو دوسرے شاعروں کے یہاں نظر نہیں آتیں، اس لیے ان کا کلام مفید بھی ہوتا ہے اور مزے کا بھی۔

ماں: تم جانتے ہو وہ بہت بڑے فلسفی بھی تھے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ انسان کو زندگی کیسے گزارنی چاہیے۔ وہ کون کون سی باتیں ہیں جن کے کرنے سے انسان دنیا میں ترقی کر سکتا ہے۔

باپ: اور اس طرح زندگی گزارنے والے انسان جب کسی قوم میں جمع ہو جائیں تو وہ قوم بھی دنیا میں کس طرح اپنا نام پیدا کرتی ہے۔

ماں: ایسے لوگ اور ایسی قوم علم میں، فن میں، سیاست میں، مذہب میں ہر جگہ آگے بڑھتی ہے اور دنیا کے دوسرے لوگ انھیں ترقی کرتے دیکھ کر حیران ہوتے ہیں اور عزت کرتے ہیں۔

باپ: مزے کی بات یہ ہے کہ انھوں نے یہ سب باتیں اس پیارے انداز میں کی ہیں کہ ہر ایک کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ مرد عورت بچّہ بوڑھا سب اس سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔

ماں: تم جانتے ہو شعر یوں بھی بڑی پیاری چیز ہے۔ جو مشکل بات ہمیں یوں سمجھ میں نہیں آتی۔ جب شعر میں آتی ہے تو فوراً دل میں اتر جاتی ہے اور ہم اسے قبول کر لیتے ہیں۔

باپ: وہ فلسفی تھے۔ اُن کا دماغ فلسفیوں کی طرح سوچتا تھا، لیکن وہ جب شعر میں بات کرتے تھے تو یہ باتیں آسان اور پیاری معلوم ہوتی تھیں ان کی بڑی بڑی نظمیں بھی پڑھو تو اُن کا مطلب ہمارے ذہن میں آجاتا ہے۔

ماں: وہ ہمیشہ پتے کی بات کرتے ہیں۔ لمبی نظم ہو یا چھوٹی، فارسی ہو یا اُردو، وہ اپنی دھن کے پکے ہیں۔ ایسی مثالیں دے کر بات کرتے ہیں کہ ان کا مطلب بھی پورا ہو جاتا ہے اور سُننے والے بھی لذت لیتے ہیں۔

باپ: اور تو اور اگر وہ غزل کہیں۔ تو وہ بھی اپنے رنگ میں کہتے ہیں۔ اس میں خالی بہار کا یا

پھولوں کی دل کشی کا ذکر بھی نہیں ہوتا۔ اس میں بھی کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق سکھا دیتے ہیں۔

ماں: اور بچّو! یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے تمھارے لیے بھی انھوں نے کئی ایک نظمیں کہی ہیں، جو تم اکثر پڑھا کرتے ہو اور گایا کرتے ہو۔ تمھیں بچّوں کی دُعا تو یاد بھی ہوگی۔

باپ: ہاں بھئی وہ تو تم اپنے اپنے مدرسوں اور گھروں میں مِل کر گایا ہی کرتے ہو۔ ریڈیو سے بھی تم نے کئی مرتبہ گایا اور سُنا ہوگا۔

ماں: لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دُور دُنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے
ہو مرے دم سے یوں ہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

باپ: اگر ہر پھول اپنی اپنی جگہ رنگین اور خوب صورت ہو تو سارا باغ کِس طرح خوب صورت نظر آتا ہے۔ اسی طرح ایک وطن کے رہنے والے لوگ اگر اپنی اپنی جگہ اپنا فرض پورا کریں اور ترقی کریں تو ساری قوم ترقی کرتی ہے اور باغ کی طرح خوب صورت بن جاتی ہے۔

ماں: اس نظم کے آخر میں وہ کہتے ہیں۔
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے ضعیفوں سے محبّت کرنا

باپ: دیکھو اس نظم میں ساری باتیں انھوں نے وہی کہی ہیں، جو شروع میں ہم نے تمھیں بتائی تھیں کہ اچھی زندگی کیا ہوتی ہے؟ اسی کو زندگی کا فلسفہ کہتے ہیں۔

ماں: اسی طرح کی وہ نظم بھی ہے، جس کا عنوان "ہمدردی" ہے۔
ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا
بلبل تھا کوئی اُداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی
اُڑنے چُگنے میں دِن گزارا
پہنچوں کِس طرح آشیاں تک
ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سُن کر بلبل کی آہ وزاری
جگنو کوئی پاس ہی سے بولا

حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے
کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری
میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل
چمکا کے مجھے دیا بنایا
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

دیکھا اس میں بھی وہی مضمون ہے، جو بچوں کی دعا میں تھا، یعنی ایک دوسرے کی ہمدردی۔

باپ: اقبال نے بچوں کی نظمیں بڑی سادہ زبان میں لکھی ہیں۔ مطلب کے سمجھنے میں کہیں دقت نہیں ہوتی۔ زبان بھی ہلکی پھلکی ہوتی ہے اور وزن بھی ہلکا پھلکا ہوتا ہے۔ ننھی منی زبانوں سے آسانی کے ساتھ ادا ہو سکتا ہے۔ جہاں بول لمبے ہیں وہاں بھی وزن ایسا پیارا ہے کہ نظم گیت کی طرح گائی جاتی ہے۔
پرندے کی دعا کی نظم جانتے ہو نا۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانا
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا
آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں
کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کو ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں
جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے
آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

ماں: دیکھو ایک اور ہلکی پھلکی نظم

نظمیں سناتے ہیں۔ نظمیں مزا آئے
گا کہانی کی کہانی ہے اور نظم کی
نظم۔ تم دیکھو گے کہ ہمارا شاعر
کتنی بڑی بڑی باتیں قصے کہانی
کی صورت میں بیان کر جاتا ہے

اک چراگاہ ہری بھری تھی کہیں
تھی سراپا بہار جس کی زمیں
کیا سماں اس بہار کا ہو بیاں
ہر طرف صاف ندیاں تھیں رواں
تھے اناروں کے بے شمار درخت
اور پیپل کے سایہ دار درخت
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں
طائروں کی صدائیں آتی تھیں
کسی ندی کے پاس اک بکری
چرتے چرتے کہیں سے آنکلی
جب ٹھہر کر اِدھر اُدھر دیکھا
پاس اک گائے کو کھڑے پایا
پہلے جھک کر اُسے سلام کیا
پھر سلیقے سے یوں کلام کیا
کیوں بڑی بی مزاج کیسے ہیں
گائے بولی کہ خیر اچھے ہیں
کٹ رہی ہے بُری بھلی اپنی
ہے مصیبت میں زندگی اپنی
جان پر آ بنی ہے کیا کہیے
اپنی قسمت بری ہے کیا کہیے
دیکھتی ہوں خدا کی شان کو میں
رو رہی ہوں بروں کی جان کو میں
زور چلتا نہیں غریبوں کا
پیش آیا لکھا نصیبوں کا
آدمی سے کوئی بھلا نہ کرے
اس سے پالا پڑے خدا نہ کرے
دُودھ کم دوں تو بڑبڑاتا ہے
ہوں جو دبلی تو بیچ کھاتا ہے
ہتھکنڈوں سے غلام کرتا ہے
کن فریبوں سے رام کرتا ہے
اس کے بچوں کو پالتی ہوں میں
دودھ سے جان ڈالتی ہوں میں
بدلے نیکی کے یہ بُرائی ہے
میرے اللہ تیری دہائی ہے
سن کے بکری یہ ماجرا سارا
بولی ایسا گلہ نہیں اچھا
بات سچی ہے بے مزا لگتی
میں کہوں گی مگر خدا لگتی
یہ چراگہ، یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا

یہ ہری گھاس اور یہ سایا
ایسی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں
یہ کہاں بے زباں غریب کہاں
یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں
لطف سارے اسی کے دم سے ہیں
اس کے دم سے ہے اپنی آبادی
قید ہم کو بھلی کہ آزادی
سو طرح کا بنوں میں ہے کھٹکا
واں کی گزران سے بچائے خدا
ہم پہ احسان ہے بڑا اس کا
ہم کو زیبا نہیں گلہ اس کا
قدر آرام کی اگر سمجھو
آدمی کا گلہ کبھی نہ کرو
گائے سن کر یہ بات شرمائی
آدمی کے گلے سے پچھتائی
دل میں پرکھا بھلا بُرا اس نے
اور کچھ سوچ کر کہا اس نے
یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان)

ہنسو گے تو نہیں

ایک بہرا: ایک چیز کی طرف اشارہ کرکے۔ کتنے کا ہے۔
دوسرا بہرا: پانچ کا ہے
پہلا بہرا: ہٹو جی۔ کانچ کا نہیں ہے دام بتاؤ۔؟
دوسرا بہرا: جھنجلاکر۔ کانچ کا نہیں۔ پانچ کا ہے۔ پانچ انگلیوں سے اشارہ کرتا ہے۔
پہلا بہرا: سمجھ گیا۔ تین کا ہوگا۔ پانچ کا نہیں ہوسکتا۔
دوسرا بہرا: ٹین کا نہیں کانچ کا۔

کمرۂ امتحان میں ماسٹر صاحب لڑکوں سے کہہ رہے تھے۔ کہ جو جو نقل کرکے لایا ہے، میرے پاس جمع کردے۔
تمام لڑکے جمع کرتے ہیں، لیکن زاہد نہیں جمع کرتا ہے۔
ماسٹر صاحب: زاہد تم کچھ نہیں لائے۔
زاہد: جی! لایا ہوں، مگر اتفاق سے وہ سب کام آگیا ہے۔
(سید افتخار احمد کوثر۔ ڈھاکہ)

دیس دیس کی کہانیاں

سونے کی گیند

پیارے بچو! یہ ہمارے ملک سے ہزاروں میل دُور آئرلینڈ کے ملک کی کہانی ہے۔ سینکڑوں، ہزاروں برس پہلے کا ذکر ہے۔ آئرلینڈ کے علاقے میں ہر شخص بہت غریب تھا، کیوں کہ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ اناج اُگتا تھا، نہ سبزیاں تھیں۔ کھاتا تو کیا کھاتا۔ زمینیں سب کی سب بنجر پڑی تھیں۔ کھیتی باڑی کرنا کوئی جانتا ہی نہ تھا۔ انسان، حیوان، گائے بھینس دودھ کیسے دیتیں۔ چاروں طرف پہاڑیاں تھیں اور پتھریلی چٹانیں۔

اس زمانے میں ایک گاؤں میں ایک لڑکا رہتا تھا، اس کا نام پیٹرک میکائیل تھا۔ وہ بڑا محنتی اور سمجھ دار تھا، مگر اُس کے پاس بھی کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ اس نے اپنی عقل سے کام لے کر کھانے کا یہ انتظام تو کرلیا تھا کہ جنگل میں جاتا اور جھاڑ جھنکاڑ جمع کر کے لے آتا، انھیں پانی میں ڈال کر آگ پر پکاتا اور شوربا بنا کر مزے سے پی لیتا۔ اس طرح وہ لوگ زندگی کے دن گزارتے۔

پیٹرک جب جنگل کو جاتا اور جھاڑیوں کے ٹکڑے جمع کرتا تو سوچتا رہتا کہ اگر پہاڑیوں کے اس پار سے کوئی ننھا بونا ادھر آنکلے تو ادھر کی چٹانوں میں سے سونا نکالنے کی ترکیب اس سے معلوم ہوسکے۔

ایک دن پیٹرک جنگل میں جھاڑ جمع کر رہا تھا کہ پہاڑی کے پیچھے سے ایک بونا نکل کر آتا دکھائی دیا۔ وہ بونا بے چارہ بہت بھوکا تھا۔ مدتوں کی بھوک سے وہ سوکھ کر تنکا ہو رہا تھا۔ بونے نے ادھر اُدھر ڈھونڈنا شروع کیا کہ شاید کچھ کھانے کو مل جائے، مگر وہاں تو گھاس کا ایک تنکا بھی دکھائی نہ دیتا تھا، ملتا تو کیا ملتا۔ دُبلا پتلا ننھا بونا آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا آگے بڑھا اور پیٹرک کو جھاڑ کے ٹکڑے چنتے ہوئے دیکھ کر پوچھنے لگا، "یہاں کچھ کھانے کے لیے مل سکتا ہے؟" پیٹرک نے اُسے بتایا کہ یہاں کچھ بھی نہیں۔ میں یہ جھاڑ کے ٹکڑے پانی میں پکا کر ان کا شوربہ پیتا ہوں۔ بونے نے بھوک سے بیتاب ہو کر اس سے کہا، "مجھے بھی تھوڑا سا شوربہ دے دو۔ میں تمھارے ساتھ جھاڑ جمع کرتا ہوں۔"

پیٹرک نے اس پر ترس کھا کر کہا، "آؤ جمع کرو، میں شوربہ تو تمھیں بھی دوں گا اور پھر شوربہ تیار ہوا تو ننھے بونے نے شوربہ پی کر پیٹرک کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور دعائیں دیتا چلا گیا۔

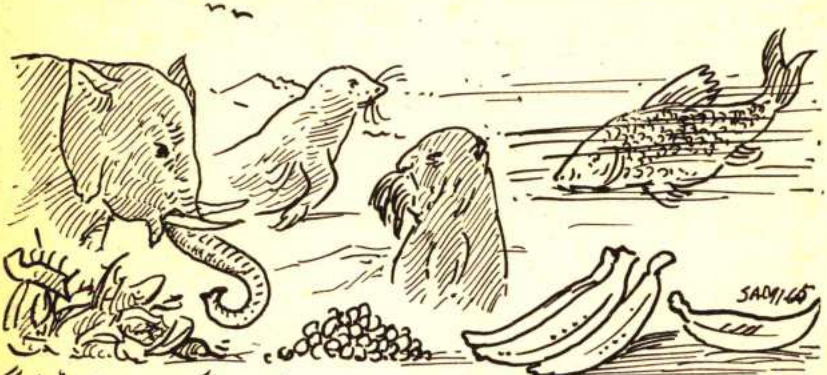
اس کے بعد بونا روزانہ پہاڑی کے پاس

آتا اور جھاڑ کے ٹکڑے جمع کر کے پیٹر کو دیتا اور پیٹرک کا تیار کیا ہوا شوربہ پی کر اسے دُعائیں دیتا خوش خوش چلا جاتا۔ اسی طرح مدت گزر گئی۔ بونے نے اپنے اور کئی ساتھیوں کو بھی یہ ترکیب بتا دی اور دیکھتے ہی دیکھتے اِن جھاڑیوں سے بھی سارے جنگل خالی ہو گئے۔

پیٹرک کو بڑی فکر ہوئی کہ اب ہم کیا کھائیں گے۔ اس نے ایک دن گھر والوں سے کہا، "میں نے بڑی غلطی کی جو بَونے کو شوربے کی ترکیب بتا دی۔ ہم اب بھوکے رہیں گے۔" اس کے باپ نے کہا، کوئی ڈر نہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہماری طرح ہے۔ سب کا مِل جُل کر کھانا اچھا ہوتا ہے۔ ایسی خود غرضی نہیں کرنی چاہیے۔ دیوتا کوئی اور سامان کر دیں گے۔ ان کا بھلا ہو، ہمارا بھی بھلا ہو۔" ایک دن بَونا پیٹرک کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ چلو ہم سب مل کر چٹانوں کو کاٹتے ہیں۔ پھر زمینوں کی کھدائی کریں گے، شاید اس میں سے کچھ کھانے کو نکلنے لگے۔ سب نے مِل کر چٹانوں اور زمینوں کو کھودنا شروع کر دیا۔ کئی دن کھُدائی کرتے کرتے زمین سے کچھ موٹے موٹے سخت قسم کے ٹکڑے سے نکلے۔ پیٹرک نے کہا، "چلو، انھیں پکا کر دیکھیں، شاید صاف ہونے سے سونا نکل آئے، پھر ہم سب مالدار ہو جائیں گے اور کسی دوسرے ملک جا کر کھانے پینے کا سامان لے آئیں گے۔"

وہ ٹکڑے جمع کر کے پیٹرک کے گھر لے گئے۔ اس نے انھیں پانی میں ڈال کر آگ پر پکانا شروع کیا۔ ان ٹکڑوں کا رنگ پکتے پکتے لال پیلا ہونے لگا۔ جب انھوں نے پانی سے ان ٹکڑوں کو نکالا اور دبا کر دیکھا تو وہ نرم ہو گئے تھے۔ پیٹرک یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کہنے لگا، "یہ ضرور سونا ہے۔ دیوتا نے ہمیں سونا دے دیا۔" اس کے باپ نے دیکھا تو کہا، "یہ سونا نہیں ہے۔ یہ تو کوئی اور ہی چیز ہے۔ کیوں نہ ہم اس کا شوربا بنا کر پی لیں۔" پیٹرک سونا نہ ملنے سے مایوس ہو گیا، مگر سب نے ان ٹکڑوں کا شوربا پینا شروع کر دیا، جو بہت ہی مزے دار تھا۔ آخر وہ روزانہ زمینیں کھودتے رہے۔ کچھ دن بعد یہی چیز ان کی غذا بن گئی، پھر انھوں نے ان ٹکڑوں کو جمع کر کے اُسے دوسرے گاؤں میں لے جا کر تجارت شروع کر دی اور ہوتے ہوتے سب کے سب بہت زیادہ مالدار ہو گئے، جیسے وہ ٹکڑے ان کے لیے سونا بن گئے اور کچھ مدت بعد دوسرے ملکوں کو بھی بھیجے جانے لگے، جہاں کے لوگوں نے دیکھ کر بتایا کہ یہ آلو ہیں۔ کہتے ہیں آئرلینڈ میں سب سے پہلے آلو اسی طرح پیدا ہوئے، جنھوں نے عمدہ غذا بن کر ساری آبادی کی پرورش کی اور اپنی محنت کا پھل پا کر وہاں کے لوگ دولت مند بنے۔ یہ آلو بَونے اور پیٹرک کی نیک نیتی اور سخت محنت و ہمت کی بدولت سونے سے زیادہ کار آمد ثابت ہوئے۔

غذا حاصِل کرنے کے مختلف طریقے



ہم سب ایک تہذیب یافتہ ملک کے باشندے ہیں۔ ہمارے ہاں غذا فراہم کرنے کے طریقے وہی ہیں، جو کسی متمدن ملک میں ہونے چاہییں، لیکن دنیا کے بہت سے باشندے اب بھی جنگلی پھلوں اور وحشی جانوروں کے گوشت پر گزر اوقات کرتے ہیں۔ شکاریوں کی زندگی میں خوشی اور فاقہ مستی کے دور اکثر آتے رہتے ہیں۔ جب کبھی شکار ہاتھ آگیا تو پیٹ بھر لیا اور اتنا کھایا کہ پیٹ میں جگہ باقی نہ رہی اس کے بعد خوب ناچ گا کر سو رہے اور کافی وقت سونے میں ہی گزار دیا۔

ملایا کے "سیمنگ" اور "سکاٹی" کانگو کے جنگلات میں بسنے والے بونے اور جنوبی امریکا میں دریائے امیزان کے بیسن میں بسنے والے لوگ شکار پر ہی گزارہ کرتے ہیں شکاری قبیلوں میں یہ لوگ سب سے پیچھے ہیں۔ ان کی سادگی کی انتہا یہ ہے کہ ان کے چاروں طرف کھیتی باڑی کرنے والی قومیں آباد ہیں، لیکن وہ ان سے کوئی سبق نہیں لیتے۔ وہ چند درختوں کی جڑیں کھاتے ہیں، جو آلو سے ملتی جلتی ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ بیر، کیلے اور چند جنگلی پھلوں پر گزران کرتے ہیں، جو اُن کے

علاقے میں پیدا ہوتے ہیں۔

افریقہ کے بونے مچھلی اور جنگلی جانوروں کے شکار کو اسی وقت باہر نکلتے ہیں، جب بھوک سے تنگ آجاتے ہیں۔ وہ چاقو، نیزے اور کمان سے شکار کھیلتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ زہریلے تیر بھی استعمال کرتے ہیں لیکن اُن کا شکار گلہریوں، چڑیوں اور بندروں تک ہی محدود رہتا ہے۔ مچھلیاں پکڑنے کے لیے وہ جنگلی بیلوں سے جال تیار کرتے ہیں۔

بونے اور سیمنگ دنیا کے استوائی علاقوں میں بڑی سخت اور خطرناک زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب کبھی ہاتھی یا گینڈے کا شکار کرنا ہوتا ہے تو پورا قبیلہ اس کام میں شریک ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر ان کا اتفاق دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ کچھ لوگ لکڑی کے اوزاروں یا ننگے ہاتھوں سے گڑھے کھودتے ہیں اور انھیں درختوں کی شاخوں اور پتوں سے ڈھانپ دیتے ہیں۔ یہ سب انتظام شکار سے ۲، ۳ دن پہلے مکمل کرلیا جاتا ہے تاکہ اس علاقے سے انسانی جسم کی بو ختم ہوجائے، ورنہ ہاتھی قریب نہیں آئے گا۔

یہ سب کچھ کرنے کے بعد کچھ لوگ ڈھول پیٹتے ہوئے جنگل میں آگے بڑھتے ہیں تاکہ ہاتھی ان گڑھوں کی طرف بھاگیں۔ باقی لوگ، جو عام طور سے سنّو کے قریب ہوتے ہیں، تیر کمانوں اور بھالوں سے مسلح ہوکر قریب ہی چھپ جاتے ہیں، تاکہ شکار پر ٹوٹ پڑیں۔ یہ موقع اچھا خاصا ہوتا ہے اور بعض اوقات کئی آدمی خود شکار ہوجاتے ہیں۔

کام یابی ہوجانے پر ہاتھی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا ہے۔ اس کی کھال اتار کر گوشت کو چھوٹے چھوٹے حصّوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس کے دانت اور ہڈیاں علیحدہ کرلی جاتی ہیں۔ اور اس کے فوراً بعد ہی سارا قبیلہ دعوت میں مشغول ہوجاتا ہے۔ گانا بجانا اور شور شغب اس موقع کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔

اِسی طرح اسکیمو باشندے بھی شکار پر ہی گزارا کرتے ہیں اور زمین کے انتہائی

شمالی حصوں میں رہتے ہیں۔ اسکیمو کی غذا میں مچھلی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ اُسے ابال کر بھی کھاتا ہے اور کچا بھی۔ گوشت پکانے کے لیے اسکیمو ایک بڑا سا چراغ استعمال کرتے ہیں، جس میں مچھلی کی چربی جلتی ہے۔ اس سے اتنی گرمی نکلتی ہے کہ گوشت پک جاتا ہے۔

سب لوگ ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں، لیکن پلیٹ یا رکابی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ گوشت کے ٹکڑے ہاتھوں ہاتھ ایک سرے سے آخر تک چلتے ہیں اور منھ میں رکھ لیے جاتے ہیں۔ اسکیمو میں شکار کرنے کا سلیقہ سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ وہ تھوڑے سے تھوڑے سامان کے ساتھ بڑے سے بڑا جانور شکار کر لیتا ہے۔ سیل مچھلی اس کی خاص غذا ہے، جسے وہ عجیب دل چسپ طریقے سے شکار کرتا ہے۔

سیل مچھلی برف کے اندر اپنا گھر بنا لیتی ہے۔ اسکیمو کے سدھائے ہوئے کتے سونگھ کر اس جگہ کا پتہ لگا لیتے ہیں، جہاں سیل کا گھر موجود ہو۔ اسکیمو اسی جگہ برف پر بیٹھ جاتا ہے اور جیسے ہی سیل سانس لینے کے لیے برف سے اپنا منھ باہر نکالتی ہے وہ اپنے نیزے سے اُسے مار لیتا ہے۔ اس انتظار میں کئی کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں۔

اسکیمو سیل کا گوشت کھاتا ہے، اس کی کھال کے کپڑے پہنتا ہے اور اس کی چربی کو روشنی اور گرمی کے لیے استعمال کرتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور مچھلی "والرس" ہوتی ہے۔ اسکیمو اپنے ڈونگے میں بیٹھ کر اس کا شکار کرتا ہے۔ جاڑا شروع ہونے سے پہلے اور ختم ہونے کے بعد جھیلوں اور دریاؤں میں پانی رواں ہو جاتا ہے اور صرف اسی زمانے میں اس مچھلی کو شکار کیا جاتا ہے۔ اب الاسکا اور شمالی کینڈا کے اسکیمو باشندوں نے بہت ترقی کر لی ہے۔ وہ بڑی مچھلیوں کے شکار کے لیے بندوق استعمال کرتے ہیں۔ اچھے کپڑے پہنتے ہیں، اچھے مکانوں میں رہتے ہیں اور ترقی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بار بار پڑھنے کے قابل

صحبت کا اثر

مہرؔ دہلوی



بازار میں جو شام کو میرا ہوا گزر — نظارہ تھا عجیب تماشا تھا طُرفہ تر
بیٹھے دکان دار تھے اپنی دکان پر — پھرتے تھے جوق جوق خریدار ادھر اُدھر
میٹھی صدا تھی خوانچے والوں کی اِس طرح
آوازِ عندلیبِ گلستاں ہو جس طرح

دوڑائے بگھیاں یہاں پھرتے تھے سب امیر — اپنی صدا سُناتے تھے آآ کے کل فقیر
سودا بہت خرید رہے تھے جوان دبیر — آئے تھے بعض سیر کو تھے بعض راہ گیر
یاں اک دکاں بھی تھی کہ گیا کوئی جب وہاں
چہرے سے اس کے جوشِ مسرّت ہوا عیاں

گندھی کی یہ دکان تھی خوش بو تھی عطر کی — جس سے دل و دماغ میں آتی تھی تازگی
ہر چیز آس پاس کی تھی عطر میں بسی — یاں کی ہوا نسیمِ بہاری سے کم نہ تھی
تھی ایک ہی دکاں پہ یہ خوش بو کا حال تھا
بازار آس پاس کا تھا سب مہک رہا

تھی پاس ہی لگی وہ کہ جانا تھا مجھ کو واں — کچھ آگے بڑھ کے کوئلے والے کی تھی دکاں
جھونکا چلا ہُوا کا جو اس وقت ناگہاں — وہ کالی کالی خاک پڑی مجھ پہ سب یہاں
کپڑوں کو جھاڑتا رہا کالک نہیں گئی
آنے کی اس جگہ مجھے اچھی سزا ملی

رہ رہ کے آیا میری طبیعت میں یہ خیال — صحبت عجیب چیز ہے اس کا عجب ہے حال
ہر شے میں عطر کی تھی وہاں بُوئے بے مثال — کالک ہے کوئلے کی یہاں جان کو وبال
انساں بھلا ہے اس کو جو صحبت بھلی ملے
لیکن یہی بُرا ہے جو صحبت بُری ملے

جا ایسی صحبتوں میں اگر تجھ کو ہے تمیز — سب کو ہو بُوئے عطر کے مانند تو عزیز
بچتا رہ اے عزیز بُری صحبتوں سے نیز — کاجل کی کوٹھڑی میں ہے کالک ہی ایک چیز
صحبت نہ رکھ بُروں سے کہ رُسوا کہیں تجھے
اچھوں میں بیٹھ مہرؔ کہ اچھا کہیں تجھے

ہمارے بزرگوں نے بہت سی چیزیں ایسی لکھی تھیں، جو ایک زمانہ گزرنے کے بعد اب بھی پڑھنے اور فائدہ اٹھانے کے قابل ہیں۔



خوبصورت بہادر چیتا

مناظر صدیقی

جو بہادر نیما کو پیارا تھا مگر....

جنگل کی گھنی جھاڑیوں سے باہر نکل کر کانگ نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اُسے اپنے قریب ہی تقریباً بیس قدم کے فاصلے پر کسی آدمی کی بُو محسوس ہوئی تھی اور آدمی کی بُو سونگھ کر کانگ کسی قیمت پر بھی اسے زندہ چھوڑنے کو تیار نہ تھا، لیکن دوسری طرف اس کا دشمن نیما بھی کچھ کم پھرتیلا نہ تھا۔ وہ کانگ کے ہر حملے سے بچنے کے لیے تیار تھا۔

ہمالیہ کے گھنے جنگلوں میں جہاں اونچے اونچے درخت اور گھنی جھاڑیاں ہوتی ہیں۔ جہاں جنگل کے خوف ناک درندوں کا راج ہوتا ہے، وہاں شرپا قبیلے کا نوجوان نیما بڑی بہادری سے جنگلوں کی سیر کرتا پھرتا۔ خوف ناک جانوروں سے بچنے کے لیے اُس کے پاس صرف کُکری ہوتی۔ یہ ایک ایسا ہتھیار ہوتا ہے، جس کی شکل تلوار کی طرح ہوتی ہے، لیکن لمبائی میں صرف کسی بڑے چھرے کی مانند ہوتا ہے۔ نیما کو اپنی کُکری سے بڑا پیار تھا۔ استرے جیسی تیز دھار والی کُکری نے اکثر اس کی جان بچائی تھی۔

دن بھر پہاڑوں پر گھومنے کے بعد شام کو نیما جب اپنے گاؤں پالی میں آتا تو گاؤں کے چودھری سوندار کی ممناتی ہوئی بھیڑیں اُسے بہت پیاری لگتیں، لیکن جب وہ سوچتا کہ سوندار کی بھیڑیں روز بروز کم ہوتی جارہی ہیں تو اُسے بڑا دکھ ہوتا اور ظالم کانگ پر بھی غصہ آتا جو روزانہ سوندار کی بھیڑیں اٹھالے جاتا تھا۔

کئی مرتبہ جنگلوں میں گھومتے ہوئے نیما اور کانگ کا آمنا سامنا بھی ہوا لیکن نہ تو کانگ ہی نے نیما پر حملہ کیا اور نہ ہی نیما نے کانگ کو مارنے کا خیال کیا۔ حالاں کہ نیما کو کانگ سے بڑی نفرت تھی، لیکن وہ جب بھی جنگل کے اس بادشاہ کو دیکھتا تو نیما کو اس کی خوب صورتی پر پیار سا آنے لگتا اور وہ کانگ کو اپنی راہ نکل جانے دیتا۔

کانگ تھا بھی خوب صورت چیتوں کی کھال حالاں کہ پیلے رنگ کی ہوتی ہے، لیکن کانگ کی کھال سرخی مائل تھی اور اس سرخ سی کھال پر سیاہ رنگ کے بڑے بڑے نشانات نیما کو بڑے پیارے لگتے، لیکن جب کانگ کا ظلم حد سے بڑھ گیا اور روزانہ سوندار کی ایک بھیڑ غائب ہونے لگی تو سوندار نے شہر سے کسی شکاری کو بلاکر کانگ کو ختم کرنے کی ترکیب سوچی۔

پہاڑوں کی اونچی اونچی چوٹیوں کے پیچھے سے ایک روز جب سورج نمودار ہوا تو اُسی وقت شہر کی طرف سے سوندار اور ایک اجنبی اس چھوٹے سے گاؤں پالی کی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ سوندار کے ساتھ جو اجنبی تھا، اس کا رنگ سُرخ اور گال اندر کو دھنسے ہوئے تھے۔ خاکی قمیص، خاکی پتلون اور سر پر دھوپ سے بچنے کے لیے ہیٹ لگائے ہوئے یہ اجنبی نیما کو کچھ اچھا نہ معلوم ہوا۔ اجنبی کے ہاتھ میں بندوق دیکھ کر تو نیما کو جیسے بڑا افسوس ہوا، لیکن فوراً ہی خود نیما کو اندازہ نہ ہوا کہ یہ افسوس کیوں ہے؟

گاؤں پہنچ کر سوندار نے جب گاؤں والے کو بتایا کہ یہ اجنبی خالص انگریز ہیں۔ ان کا نام وے لینڈ صاحب ہے اور یہ چیتے کا شکار کرنے میں بڑی شہرت رکھتے ہیں اور سوندار انھیں کانگ سے نجات حاصل کرنے کے لیے ساتھ لایا ہے تو

نیما کو دکھ ہوا کہ جنگل کے بادشاہ کو اس طرح مارا جائے کہ دور ہی سے بیچارا گولی کا نشانہ بن جائے اور مقابلہ نہ کر سکے، لیکن چودہری سوندار تو فیصلہ کر چکا تھا۔

رات گاؤں میں بڑا جشن منایا گیا۔ الاؤ روشن کیے گئے اور سوندار کی بھیڑوں کے گلے میں جنگلی پھولوں کے ہار ڈالے گئے۔

آج ان بھیڑوں کے لیے خطرہ کا آخری دن تھا، کیوں کہ کل رات کانگ کی زندگی کی آخری رات تھی۔ وے لینڈ صاحب نے فیصلہ کیا تھا کہ کل جب چاند نکلے گا تو کانگ کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا جائے گا۔ وے لینڈ صاحب کی بندوق کی ایک ہی گولی کانگ کے لیے بہت کافی ہو گی۔ وے لینڈ صاحب کو یقین تھا کہ اُن کا



"کانگ نے کئی بار ہماری بھیڑوں پر حملہ کیا ہے۔ اسے مارنا ضروری ہے!"

نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا، لیکن نیما اپنی جھونپڑی میں پڑا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کوئی ایسی ترکیب کرنی چاہیے، جس سے کم از کم کانگ اس اجنبی شکاری کی گولی کا نشانہ نہ بنے۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی سوندار نے گاؤں کے کئی آدمیوں کو جگا دیا، تاکہ وہ جنگل میں جا کر وے لینڈ صاحب کے لیے مچان بنائیں۔ وے لینڈ صاحب نے کہا تھا کہ چیتے کا شکار مچان پر سے ہی ہوسکتا ہے اور اس کام کے لیے سوندار نے گاؤں سے جن آدمیوں کو چُنا تھا اُن میں سے ایک بہادر نیما بھی تھا۔ اس کے ذمّے یہ کام تھا کہ وہ مچان بنانے والوں کی رہنمائی کرے اور ایسی جگہ مچان بنوائے، جہاں سے کانگ کا شکار کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

نیما اور اس کے ساتھی جنگل میں پہنچے تو نیما نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ کانگ کو ہلاک کرنے کے لیے سمندر پار کے شکاری کو بلانے سے اُسے بہت دکھ ہوا ہے۔ دور دیس کے شکاری کو بلانے سے تو اچھا تھا کہ کانگ کو مارا ہی نہ جائے، لیکن نیما کے ساتھیوں نے جن میں سے دو بوڑھے بھی تھے، نیما کو بتایا کہ جنگل کے اس دیو نے کئی بار ان کی بھیڑوں پر حملہ کیا ہے اور اُسے مارنا بہت ضروری ہے۔

نیما نے پھر بھی اپنے ساتھیوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اس سرخ چیتے کانگ کو وہ خود ہلاک کرسکتا ہے۔ نیما کی تیز دھار والی کُکری کانگ کی زندگی ختم کرنے کے لیے کافی ہے۔ پالی کے دیہاتیوں نے ایک دوسرے کی شکلیں حیرت اور تعجب سے دیکھیں اور آخر کار اُن میں سے ایک نے کہا،

"وہ تو اس جنگل کے چیتوں میں سب سے بڑا دیو ہے اور نیما صرف اپنی کُکری کی مدد سے اسے ہلاک نہ کرسکے گا۔"

نیما کو دیہاتی کا یہ جواب کچھ اچھا نہ لگا اور اس نے بڑے فخر سے کہا، "جنگل کا کوئی جانور ایسا نہیں ہے، جو میری کُکری سے بچ سکے۔"

ٹھیک اسی وقت چودھری سوندار بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ اُس نے بھی نیما کا

یہ جملہ سن لیا تھا۔ سوندار نے نیما کے مضبوط اور گٹھے ہوئے بازوؤں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا، "شرپا قبیلے کے سپوت بھی تو تمھاری غلطی ہے۔ اس جنگلی دیو کو ہلاک کرنے کی ہمّت تو تنہا وے لینڈ صاحب میں بھی نہیں ہے، انھوں نے بھی اپنی مدد کے لیے دوسرے کئی صاحبوں کو بلایا ہے، جو ابھی تھوڑی دیر پہلے پالی پہنچے ہیں۔ یہ لوگ آج رات جب آسمان پر پورا چاند نکلے گا تو کانگ کو ہلاک کر دیں گے، کیوں کہ جب چاند پورا ہوجاتا ہے تو چیتے زیادہ نڈر ہوجاتے ہیں اور اُس وقت ان کا شکار آسان ہوجاتا ہے۔

"ٹھیک ہے۔" نیما نے کہا، "ہمیں اپنے پرانے دشمن کو ختم کرنے کے لیے کسی بدیسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔" اور یہ جملہ کہتے وقت نیما کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اور زیادہ چمک پیدا ہوگئی۔

"ایک اتنے بڑے چیتے کو اُس کے ظلم سے روکنے کے لیے ککرُی سے زیادہ بندوق کی ضرورت ہے۔" چودھری نے کسی قدر غصّے سے کہا، "تم اپنی جھونپڑی میں آرام کرسکتے ہو اور تمھیں تمھاری جھونپڑی ہی میں کانگ کے مرنے کی اطلاع مل جائے گی۔"

نیما نے چودھری کے ان جملوں کو اپنی توہین سمجھا اور وہ اپنی جھونپڑی کی طرف چل دیا۔ ابھی وہ دس قدم بھی نہ گیا ہوگا کہ چودھری نے اسے آواز دے کر روکا اور کہا، "صاحب کو مچان کی ضرورت ہے اور تم مچان بنانے میں گاؤں کے آدمیوں کی مدد کروگے، کیوں کہ ان لوگوں کے مقابلے میں تم ہی زیادہ اچھّی مچان بنا سکتے ہو۔"

"لیکن میں تو کھانا کھانے کے بعد مچان بناؤں گا!" نیما نے روکھے پن سے جواب دیا اور کھانا کھانے چلا گیا۔

اپنی جھونپڑی میں پہنچ کر بھُنے ہوئے جو اور چائے سے ناشتہ کرتے ہوئے نیما نے بڑے ہی غصّے سے کانگ کے شکار کے متعلق سوچا۔ اسے بڑا دکھ تھا کہ کانگ جیسے بہادر جانور کو اس طرح دھوکے سے مارا جائے۔ وہ جانتا تھا کہ رات جب گول گول چاند کی روشنی سے پہاڑوں اور جنگلوں میں اجالا پھیل جائے گا تو سوندار

چودھری کی ایک بھیڑ کسی درخت سے باندھ دی جائے گی، پھر جیسے ہی دلیر کانگ اُس بھیڑ پر حملہ کرے گا تو وے لینڈ صاحب کی بندوق کی گولی کانگ کو ہمیشہ کی نیند سُلا دے گی۔ وہ جانتا تھا کہ کانگ بہادر نیما کی طرح تنہا اپنے شکار کے لیے جنگل میں گھومتا ہے۔ کانگ کی شاہانہ چال میں ڈر اور خوف جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی اور صرف نیما کو ہی حق حاصل ہے کہ وہ کانگ کا مقابلہ کرنے، کیوں کہ ایک بہادر کا مقابلہ بہادر ہی سے ہو سکتا ہے۔ سمندر پار کے دھوکہ باز شکاریوں سے نیما کو بڑی نفرت تھی، اس لیے کہ سرخ رنگ کے شکاری انسانوں کی طرح جانوروں سے بھی دھوکہ بازی سے کام لیتے ہیں۔

سورج آسمان پر اپنا آدھا راستہ طے کر چکا تھا۔ اور اب مغرب کی سمت کے اونچے اونچے پہاڑوں کے پیچھے آرام کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسی وقت نیما بھی کھانے سے فارغ ہو چکا تھا۔ نیما نے دل ہی دل میں کوئی فیصلہ کیا، لیکن اُس فیصلے پر عمل کرنے کا وقت ابھی دور تھا۔ وہ اپنی جھونپڑی سے نکل کر جنگل کی طرف چل دیا اور جب وہ پالی کے دیہاتیوں کے پاس پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ ان دیہاتیوں نے بہت سے درختوں کی ٹہنیاں جمع کر رکھی ہیں۔ وہاں نیما کو بتایا گیا کہ جیسے ہی سورج غروب ہو گا وے لینڈ صاحب اپنی بندوق کے ساتھ کانگ کو ہلاک کرنے کے لیے جنگل پہنچ جائیں گے۔

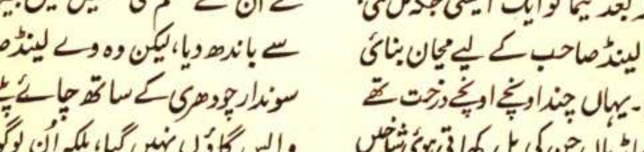
نیما نے اپنے چاروں طرف نظر



پیروں کے نشان بتا رہے تھے کہ چیتا یہاں ضرور آیا ہے

دوڑائی اور چند ہی لمحوں بعد نیما کی تیز نظروں نے وہ راستہ تلاش کر لیا جس راستے سے کانگ اپنے شکار کی تلاش میں آتا تھا۔ اس راستے میں نرم مٹی پر کانگ کے پیروں کے بہت سے نشانات تھے۔ جن میں سے کچھ پرانے اور مٹے ہوئے نظر آتے تھے اور کچھ نئے۔ ان نشانات کو دیکھ کر نیما کو یقین ہوگیا کہ کانگ اس راستے پر کم از کم دو چار بار ضرور آیا ہے۔ نیما بڑی ہوشیاری کے ساتھ اُن پیروں کے نشانات کے پیچھے چلتا رہا۔ ذرا ہی دیر بعد نیما کو ایک ایسی جگہ مل گئی، جہاں وے لینڈ صاحب کے لیے مچان بنائی جا سکتی تھی۔ یہاں چند اونچے اونچے درخت تھے اور کچھ جھاڑیاں جن کی بل کھاتی ہوئی شاخیں آپس میں اس طرح الجھ گئی تھیں، جیسے بہت سے سانپ اوپر تلے پڑے ہوں۔

ایک مضبوط سے درخت کی شاخوں پر نیما نے پالی کے دیہاتیوں کو مچان باندھنے کی ہدایت کی۔ پالی کے دیہاتیوں نے آہستہ آہستہ اپنا



بھیڑ کو درخت سے باندھ دیا گیا

کام ختم کیا۔ یہاں تک سورج مغرب کی پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا اور جنگل میں اندھیرا پھیل گیا اتنی دیر میں وے لینڈ صاحب بھی سوندار چودھری کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ وے لینڈ صاحب کو نیما نے بتایا کہ مچان ایسی جگہ باندھی گئی ہے، جہاں سے چیتا ہمیشہ گزرتا ہے اور نیما نے خود چیتے کے پیروں کے نشانات دیکھے ہیں۔ وے لینڈ صاحب کو اطمینان ہوگیا تو انھوں نے نیما سے کہا کہ وہ بھیڑ کو درخت سے باندھ دے۔ نیما نے اُن کے حکم کی تعمیل میں بھیڑ کو درخت سے باندھ دیا، لیکن وہ وے لینڈ صاحب اور سوندار چودھری کے ساتھ چائے پینے کے لیے واپس گاؤں نہیں گیا، بلکہ اُن لوگوں کی نظروں سے بچ کر آہستہ سے گھنی جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا۔

رات کا اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ سارے پہاڑ اور جھاڑیاں سیاہ ہو چکی تھیں نیما نے اسی وقت بہت سی جھاڑیاں کاٹ کر

ایک جگہ جمع کر دیں اور خود کو جھاڑیوں کے پیچھے اس طرح چھپا لیا کہ کانگ کو یہ اندازہ ہو جائے کہ کوئی آدمی یہاں موجود ہے اور کانگ واپس چلا جائے۔ اگر اس کے باوجود بھی واپس نہ لوٹا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کانگ کی موت خدا کا فیصلہ ہے۔

ذرا سی دیر بعد مشرق کے پہاڑوں کی چوٹیاں روشنی سے چمکنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے جھاڑیوں کی پتیوں پر بھی چاندی جیسی سفید روشنی پھیل گئی، لیکن نیما اُن ہی جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھا رہا۔ جنگل کے سناٹے میں سوندار چودھری کی بھیڑ کے جگالی کرنے کی آواز نیما کو صاف صاف سنائی دے رہی تھی۔ ٹھیک اُسی وقت پہاڑوں پر بھی ایک عجیب سی آواز پیدا ہوئی اور نیما کو اندازہ ہو گیا کہ کانگ شکار کی تلاش میں نکل چکا ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد بہت سے بندروں کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیں، جیسے وہ کسی دشمن کے گزرنے پر شور مچا رہے ہوں۔

چڑیوں اور جنگلی جانوروں کے شور سے نیما نے اندازہ کر لیا تھا کہ کانگ اب نیما سے کتنی دور ہے۔ نیما نے اپنی گکری نکال کر اپنے برابر رکھ لی۔ چاند کی روشنی سے نیما کی گکری چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ سوندار چودھری کی بھیڑ نے بھی جگالی کرنا بند کر دی تھی، کیوں کہ جانوروں کو خطرے کا احساس بہت جلدی ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر تک کسی قسم کا شور نہیں ہوا اور نہ کوئی آواز ہوئی جس سے نیما کو کانگ اور اپنے درمیان کے فاصلے کا اندازہ ہو سکے، لیکن اچانک بہت سے پرندے کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں درختوں سے اڑے اور نیما کو کانگ کی خوشبو کا احساس ہوا۔ اندھیرے میں نیما کو ایسا لگا، جیسے کوئی بڑا سا جانور آہستہ آہستہ گردن گھما کر اپنے چاروں طرف دیکھ رہا ہو اور نیما کو یقین ہو گیا کہ یہ کانگ ہی ہے۔ پھر اُسے دو ہرے رنگ کے چراغ بھی نظر آئے۔ یہ کانگ کی چمکتی ہوئی آنکھیں تھیں اور اب کانگ نیما کے بالکل قریب تھا۔ نیما کا ہاتھ خاموشی سے اپنی گکری پر پہنچ گیا اور ٹھیک اُسی وقت نیما کو ایک آواز سنائی دی، جیسے وے لینڈ صاحب نے اپنی بندوق اٹھائی ہو۔ اب جو نیما کی نظر کانگ پر پڑی تو اس نے دیکھا کہ کانگ اس سے صرف چھ فیٹ کے فاصلے



چیتے کی چمکتی ہوئی
آنکھیں بتا رہی تھیں
کہ اب وہ بالکل قریب ہے۔

پر ہے اور وہ بھی نیما کو دیکھ چکا ہے، لیکن شاید کانگ نیما پر حملہ کرنا نہیں چاہتا تھا، کیوں کہ بندھی ہوئی بھیڑ کی خوشبو سے کانگ خوش تھا اور اپنی دُم چاروں طرف گھماتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے کانگ کھلی چاندنی -

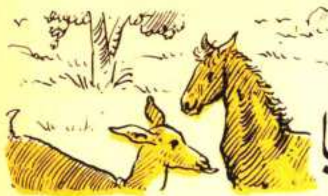
میں پہنچ چکا تھا اور اُسے شاید اچانک خطرے کا احساس ہوگیا اور بے تابی میں وہ بڑی تیزی سے اپنی دم ہلانے لگا۔ سوندار چودھری کی بھیڑ بھی خطرے کو سامنے دیکھ کر مدد کے لیے چیخی۔ اسی وقت کانگ اپنے شکار کی طرف بڑھا، لیکن وہ وے لینڈ صاحب کے نشانے کی زد پر تھا۔

ادھر نیما بھی پھرتی سے جھاڑیوں سے باہر نکلا اور اُس نے کانگ کو للکارا۔ کانگ نے پلٹ کر دیکھا تو اُسے سامنے ایک ایسا آدمی نظر آیا جس سے وہ کبھی لڑنا نہ چاہتا تھا، لیکن بندھی ہوئی بھیڑ کی بُو کانگ کے نتھنوں میں پہنچ چکی تھی۔ اور یہ آدمی اس وقت کانگ اور اس کے شکار کے بیچ میں حائل تھا۔ اب تو جنگل کے بادشاہ کو ثابت کرنا تھا کہ وہ واقعی جنگل کا بادشاہ ہے۔

نیما نے چاند کی روشنی میں کانگ کو پنجہ اٹھا کر اچھلتے ہوئے دیکھا اور فوراً ہی اس حملے سے بچنے کے لیے تیار ہوگیا۔ گھنی جھاڑیوں سے باہر نکل کر وہ کانگ کے ہر حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ دوسری طرف کانگ نے اچھل کر نیما پر حملہ کر ہی دیا۔ نیما نے بڑی پھرتی سے اپنے آپ کو اس حملے سے بچایا، لیکن پھر بھی نیما کو اپنے کندھے پر گہرے زخم کا احساس ہوا۔ تاہم نیما نے بڑی خاموشی سے اس زخم کو برداشت کرلیا اور جیسے ہی کانگ اپنی چھلانگ کے زور میں آگے بڑھا تو نیما کو حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔

چاند کی روشنی میں چمکتی ہوئی کُلہاڑی ایک ہی مرتبہ اوپر سے نیچے کی طرف جاتی ہوئی نظر آئی۔ نیما نے اپنی پوری طاقت سے یہ وار کیا تھا اور وار کامیاب بھی تھا۔ نیما کی کلہاڑی کانگ کی گردن میں اُتر گئی تھی اور کانگ کی شہ رگ بھی کٹ چکی تھی۔ کانگ اس وار کو برداشت نہ کرسکا۔ اب اُس کا مردہ جسم زمین پر پڑا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب وے لینڈ صاحب مردہ کانگ کو دیکھنے کے لیے مچان سے اترے تو انھیں شکاری کا کہیں پتہ نہ چلا، کیوں کہ بہادر نیما تو پہلے ہی وہاں سے جا چکا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے کانگ کی لاش پر کسی دوسرے آدمی کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ خدا کی مرضی اب یہی ہے کہ کانگ مر جائے، لیکن اُسے اطمینان تھا کہ کانگ دھوکے سے نہیں مارا گیا۔ کانگ جنگل کا بادشاہ تھا اور اُس نے بادشاہوں کی طرح مقابلہ کرکے اپنی جان دی۔ پھر کانگ کو تڑپنے کی تکلیف بھی نہیں ہوئی۔ کانگ بھی نیما کی طرح بہادر تھا اور بہادروں کی طرح مرا۔



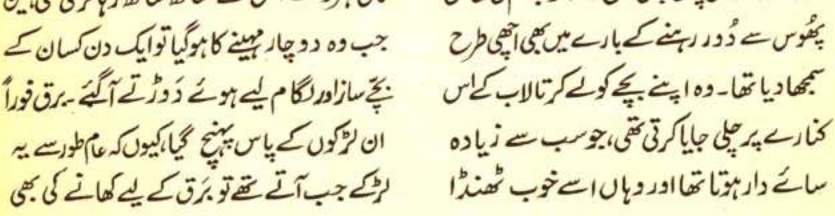
گھوڑے کا بچہ

جس کو ہرنی نے اپنا بیٹا بنایا

علی اسد

بہت دن ہوئے کسی گاؤں میں ایک چھوٹا سا گھوڑے کا بچّہ اپنی ماں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اس کا نام تھا "برق" اور اس کی ماں کا نام تھا "صبا"۔ صبا کا رنگ تھا بھورا، مگر برق بالکل سیاہ تھا۔ برق کو اپنی ماں سے بے حد محبت تھی۔ اس کے نزدیک اس کی ماں سے زیادہ محبت کرنے والا دُنیا میں اور کوئی تھا ہی نہیں۔ ماں نے اپنے بچّے کو وہ تمام مقامات دکھا دیے تھے، جہاں سب سے زیادہ شیریں اور تر و تازہ گھاس پائی جاتی تھی اور خراب قسم کی گھاس پھُوس سے دُور رہنے کے بارے میں بھی اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ وہ اپنے بچّے کو لے کر تالاب کے اس کنارے پر چلی جایا کرتی تھی، جو سب سے زیادہ سائے دار ہوتا تھا اور وہاں اسے خوب ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پلواتی تھی۔ گرمی کے دنوں میں جب برق کو مکھیاں ستانے لگتیں تو اس کی ماں اپنی دُم کا مورچھل بنا کر مکھیوں کو اُڑاتی رہتی۔ دن کے وقت برق اپنی ماں کے ساتھ کُلیلیں مارتا پھرتا اور جب رات آجاتی تو اپنی ماں سے چپک کر آرام سے سو جاتا۔ برق یہ سمجھتا تھا کہ جب تک وہ اپنی ماں کے قریب ہے، اُس وقت وہ ہر قسم کی تکلیف و پریشانی سے محفوظ ہے۔

جب تک برق بالکل ہی چھوٹا تھا، اُس کی ماں ہر وقت اُس کے ساتھ ساتھ رہا کرتی تھی، لیکن جب وہ دو چار مہینے کا ہو گیا تو ایک دن کسان کے بچّے ساز اور لگام لیے ہوئے دَوڑتے آ گئے۔ برق فوراً ان لڑکوں کے پاس پہنچ گیا، کیوں کہ عام طور سے یہ لڑکے جب آتے تھے تو برق کے لیے کھانے کی بھی



کوئی نہ کوئی چیز ضرور لاتے تھے، لیکن اس دن لڑکے بولے، "برق، آج ہم لوگ تمھاری ماں کو لے کر تفریح کرنے جا رہے ہیں۔ تم یہیں رہنا اور دیکھو کوئی شرارت نہ کرنا۔ ہم لوگ بہت جلد لوٹ آئیں گے۔" یہ کہہ کر لڑکوں نے "صبا" کے زین لگام کسی اور اُسے گاڑی میں جوت دیا۔ برق نہایت غم زدہ ہو کر یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ آخر کار اس سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ بڑے زور سے چیخ اُٹھا:

"ماں، ماں، مجھے اکیلا نہ چھوڑو!"

"صبا" نے سمجھاتے ہوئے آہستہ سے کہا، "گھبراؤ نہیں بیٹا، میں ان لڑکوں کو گھما کر ابھی واپس آئی جاتی ہوں۔ تم تھوڑی دیر صبر سے کام لو۔ میں شام تک ضرور آ جاؤں گی۔" لیکن برق بھلا کہاں سمجھنے والا تھا۔ وہ اپنے پیر پٹختا ہوا ادھر اُدھر چکّر کاٹنے لگا اور بولا، "ماں، تم نہ جاؤ۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم واپس ہی نہ آؤ۔"

صبا نے کہا، "کیسی بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔ میں کہتی ہوں کہ میں آ جاؤں گی۔ تم اطمینان رکھو۔ اب تم اتنے بچّے تو ہو نہیں۔ یہ تو جانتے ہی ہو کہ مجھے کام بھی کرنا ہی ہے۔ میں ہمیشہ تمھارے ساتھ کلیلیں مارتی نہیں رہوں گی۔"

اتنے میں لڑکے بھی برق کے چیخنے چلّانے پر ناراض ہو گئے اور بولے، "برق، تم تو ہو بالکل گدھے۔ ہم تمھاری ماں کو تم سے ہمیشہ کے لیے جُدا تھوڑی کیے دے رہے ہیں۔ بیکار تم اتنا غُل غپاڑہ مچا رہے ہو۔" لڑکوں کے منھ سے گدھے کا لفظ سُن کر برق غصّے ہو گیا، لیکن جب اُس نے اپنی ماں کو گاڑی گھسیٹتے دیکھا تو اس کا غصّہ رفوچکر ہو گیا اور وہ بلبلا کر رونے لگا۔ ماں نے چلتے چلتے کہا، "اچھا برق، خدا حافظ! دیکھو گھبرانا نہیں میں جلد ہی واپس آ جاؤں گی۔" مگر برق کو کسی طرح یقین ہی نہ آیا کہ اب وہ اپنی ماں کو پھر کبھی دیکھ بھی سکے گا۔ بات یہ تھی کہ اس سے پہلے وہ اپنی ماں سے جُدا کبھی نہ ہوا تھا اور پھر آخر ابھی وہ بچہ ہی تو تھا۔

چناں چہ وہ اصطبل کی چار دیواری کے اندر ہی اندر چکّر کاٹنے لگا۔ اتنے میں اُسے ایک جگہ پر اس لکڑی کی چار دیواری میں ذرا سی جِھری نظر آ گئی۔ یہ جِھری یُوں تو اتنی بڑی نہ تھی کہ اس کے اندر سے ہو کر ایک بڑا گھوڑا نکل سکے، مگر برق ایسے ننھے مُنّے گھوڑے کے لیے یہ شگاف بھی کافی تھا۔ برق کو ابھی تک اپنی ماں کی ٹاپوں کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کدھر گئی ہو گی۔ اُس نے گھُس پل کر چار دیواری کے باہر نکلنا چاہا۔ اس کوشش میں اس کے جسم پر بہت سی خراشیں بھی آ گئیں، مگر اُس نے پروا نہ کی۔ آخر کار وہ باہر نکل ہی آیا اور تیزی سے

اس سمت بھاگنے لگا، جدھر اُس کے خیال کے مطابق اس کی ماں گئی تھی۔ گرمی بڑی شدت کی پڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے قدم سُست پڑ گئے اور وہ دُلکی چلنے لگا۔ راستے میں جب اُسے اپنی ماں نہ دکھائی دی تو وہ پریشان اور خوف زدہ ہونے لگا۔ آخر کار وہ ایک دو راہے پر پہنچ گیا۔ یہاں اسے بڑی دشواری ہوئی۔ وہ یہ نہ طے کر سکا کہ کون سی سڑک پر روانہ ہو۔

اتنے میں اسے ایک خرگوش دکھائی دیا، جو جھاڑیوں میں بیٹھا کچھ کھا رہا تھا۔ برق نے اس خرگوش سے پوچھا، "کیا تم نے ابھی ادھر کوئی گھوڑا گاڑی جاتے دیکھی ہے؟"



خرگوش کا منہ تو بھرا ہوا تھا، مگر وہ اسی حالت میں بولا، "بھلا میں یہ کیا جانوں۔ میں تو خود ابھی ابھی یہاں پہنچا ہوں۔ ہاں تو گاڑی کس طرف گئی ہے؟"

خرگوش کے اس بے تکے سوال پر برق جھلّا گیا اور عاجز ہو کر بولا، "یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔ اس گاڑی میں جو گھوڑی جُتی ہوئی ہے، وہ میری ماں ہے۔ وہ لڑکوں کو گھمانے لے گئی ہے۔ میں اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔" یہ سُن کر خرگوش بولا،

"اچھا! یہ بات ہے۔ اگر یہ لوگ تفریح کے لیے گئے ہیں تو پھر تم داہنی طرف گھوم جاؤ۔ آگے چل کر تمھیں ایک جنگل ملے گا۔ وہاں صنوبر کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ اسی جگہ پر سڑک کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ تم بائیں جانب گھوم جانا۔ بس پھر تم پہنچ جاؤ گے۔"

برق نے خرگوش کا شکریہ ادا کیا اور فوراً روانہ ہو گیا۔ راستے بھر وہ اپنی ماں کے قدموں کے نشانات تلاش کرتا رہا۔ جب وہ صنوبر کے درختوں کے پاس پہنچا تو وہ بائیں طرف گھوم گیا۔ سامنے بالکل بنجر زمین نظر آئی۔ سڑک تو شیطان کی آنت کی طرح سیدھی چلی گئی تھی، مگر وہ بالکل خالی پڑی تھی۔ برق نے نظر اُٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔ ہر طرف بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ برق کو یہ جگہ اچھی تو معلوم ہوئی، مگر وہ سوچنے لگا کہ ماں جب ساتھ ہو گی تب یہاں گھومنے میں خوب لطف آئے گا۔ اکیلے میں یہ میدان اس کے لیے بہت بڑا تھا۔ برق اب تھک چکا تھا، کیوں کہ اس سے پہلے اس نے اتنی مسافت کبھی طے نہ کی تھی۔ قریب ہی ایک ندی تھی۔ برق

نے اس کے قریب رُک کر پانی پیا۔ آسمان پر ایک چڑیا چہچہاتی ہوئی اُڑ رہی تھی۔ برق اپنے کان کھڑے کیے ہوئے ہمت کر کے آگے بڑھا۔ اس کے دل میں صرف ایک ہی خیال تھا اور وہ یہ کہ کسی طرح اپنی ماں کے پاس پہنچ جائے۔ اپنے گھر سے وہ بہت دُور نکل آیا تھا اور اب واپس پہنچنا بھی مشکل تھا۔ اتنے میں جھاڑیوں میں سے ایک آواز آئی۔ ایک بَن مرغی بڑی شفقت سے پوچھ رہی تھی، "ننھے میاں کہاں جا رہے ہو؟" بَرق نے کہا، "مجھے خود خبر نہیں کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں اپنی ماں کو تلاش کر رہا ہوں۔ کیا تم نے اُنھیں دیکھا؟" بَن مرغی نے کہا، "نہیں، میں نے تو ادھر کسی کو بھی نہیں دیکھا۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنے گھر واپس جاؤ۔ تمھارے ایسے چھوٹے سے گھوڑے کے لیے یہ جگہ ٹھیک نہیں۔" اس پر برق بولا، "مگر مجھے تو گھر کا راستہ بھی اب یاد نہیں اور میں تو اب وہاں جانا بھی نہیں چاہتا۔ میں تو صرف اپنی ماں کے پاس پہنچنا چاہتا ہوں۔" برق اب اتنا تھک چکا تھا اور اتنا خوف زدہ ہو چکا تھا کہ اب وہ بس رونے ہی والا تھا۔ بَن مرغی کو اس کی حالت پر بڑا ترس آیا۔ اس نے اپنے پَر پھڑپھڑائے اور اُڑتے اُڑتے بولی:

"جاؤ، جاؤ، اپنے گھر چلے جاؤ۔"



سامنے سڑک پر تین آدمی آتے نظر آئے۔ برق اُنھیں دیکھ کر رُک گیا اور اس نے اپنے نتھنوں سے آواز بھی نکالی تاکہ یہ ظاہر ہو کہ وہ خوف زدہ نہیں ہے، مگر دل ہی دل میں وہ یہ سوچنے لگا کہ بہتر ہوگا کہ بَن مرغی کے مشورے پر عمل کر لیا جائے اور گھر واپس چلا جائے۔ ان آدمیوں نے جب برق کو دیکھا تو وہ چلاتے ہوئے اس کی طرف دوڑے اور بازو پھیلا کر اسے پکڑنا چاہا۔ برق ایک لمحے کے لیے تو رُکا۔ اس کے بعد اس نے اپنا سر اونچا کیا اور چھلانگ مار کر سڑک پار کر گیا اور پھر تیزی سے سرپٹ پہاڑ کی طرف بھاگنے لگا۔ کئی جگہ وہ لڑکھڑایا، مگر پکڑے جانے کے خوف سے وہ آگے ہی بڑھتا گیا۔

سورج اب غروب ہونے والا تھا۔ اس کی کرنیں پہاڑ کی چوٹی پر سونے کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہوا میں خنکی آ چلی تھی۔ برق سمجھ گیا کہ ذرا ہی دیر میں

اب رات ہو جائے گی۔ اب اسے اپنا گاؤں اور وہاں کا سکون و چین یاد آنے لگا۔ شام کے وقت اس کے گاؤں کے ہر گھر سے طرح طرح کے کھانوں کی خوشبو آنے لگتی تھی۔ چڑیاں درختوں پر بسیرا لینے کے لیے آجاتی تھیں اور چہچہاتی رہتی تھیں۔ اسے گاؤں کے بچوں کی آوازیں بھی یاد آنے لگیں۔ بچے شام کو جب کھیلتے کودتے اپنے گھروں کو لوٹتے تھے اور اس کے پاس سے گزرتے تھے تو اُسے کچھ نہ کچھ کھانے کو بھی دیتے جاتے تھے۔ پھر جب رات ہو جاتی تھی تو اس کی ماں اس کے قریب آجاتی تھی اور وہ اس سے چپک کر آرام سے بیٹھ جاتا تھا۔ اس کی ماں اپنی زبان سے اس کے جسم کو چاٹتی جاتی تھی اور وہ سکون کی نیند سو جاتا تھا، لیکن اب یہ ساری باتیں ایک خواب و خیال معلوم ہو رہی تھیں۔ یہاں پر تو ہر طرف بلا کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ صرف اِکّا دُکّا مینڈک اُچکتے دکھائی دیے جاتے تھے۔ برق کو اب یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ یہ جگہ خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔ وہ چلتے چلتے ایک دم رُک گیا اور کانپنے لگا، کیوں کہ بالکل سامنے قریب کی پہاڑی پر اُسے کچھ گھوڑے نما سائے نظر آگئے۔ ان میں سے بعض کے سَروں پر درختوں کی سی شاخیں بھی تھیں، مگر ان میں گھوڑوں کی سی بُو نہ تھی۔ اپنی ہمت کو برقرار رکھنے کے لیے برق بڑے زور سے ہنہنانے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر یہ عجیب و غریب سائے گھوڑے ہی ہیں تو وہ بھی ہنہنا کر جواب دیں گے، لیکن برق کے ہنہنانے پر ان سایوں نے ایک دم سے اپنے سر اُٹھائے اور ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ جن کے سروں پر شاخیں تھیں، وہ بڑے مغرور اور خطرناک نظر آرہے تھے۔ اب تو برق سوچنے لگا کہ کاش میں خاموش ہی رہا ہوتا تو بہتر تھا۔ سائے اسی طرح گھورتے رہے اور برق بھی اُنھیں گھورتا رہا۔ آخر کار ان میں سے ایک شے جس کے سر پر شاخیں نہ تھیں اور جس کی آنکھیں نہایت حسین تھیں خراماں خراماں برق کے قریب پہنچی اور بولی، "ارے بچے، تم یہاں اکیلے کیا کر رہے ہو۔ تمھاری ماں کہاں ہے؟" برق کو اس کی آواز بالکل اپنی ماں کی سی محسوس ہوئی۔ چناں چہ وہ رو پڑا اور بولا، "مجھے نہیں معلوم کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں بہت تھک گیا ہوں اور مجھے



بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میں راستہ بھول گیا ہوں۔ میں اپنی ماں کو ڈھونڈنے نکلا تھا۔ وہ چند لڑکوں کو گھمانے لے گئی تھیں۔ نہ جانے میں کب سے انھیں تلاش کر رہا ہوں، مگر وہ کہیں دکھائی ہی نہیں دیتیں۔ پہلے تو میں اپنے گھر نہیں جانا چاہتا تھا، مگر اب جو جانا چاہتا ہوں تو مجھے راستہ نہیں ملتا۔ اب تو شاید مجھے اپنی ماں کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہو سکے۔" یہ کہہ کر برق بُری طرح سے رونے لگا۔

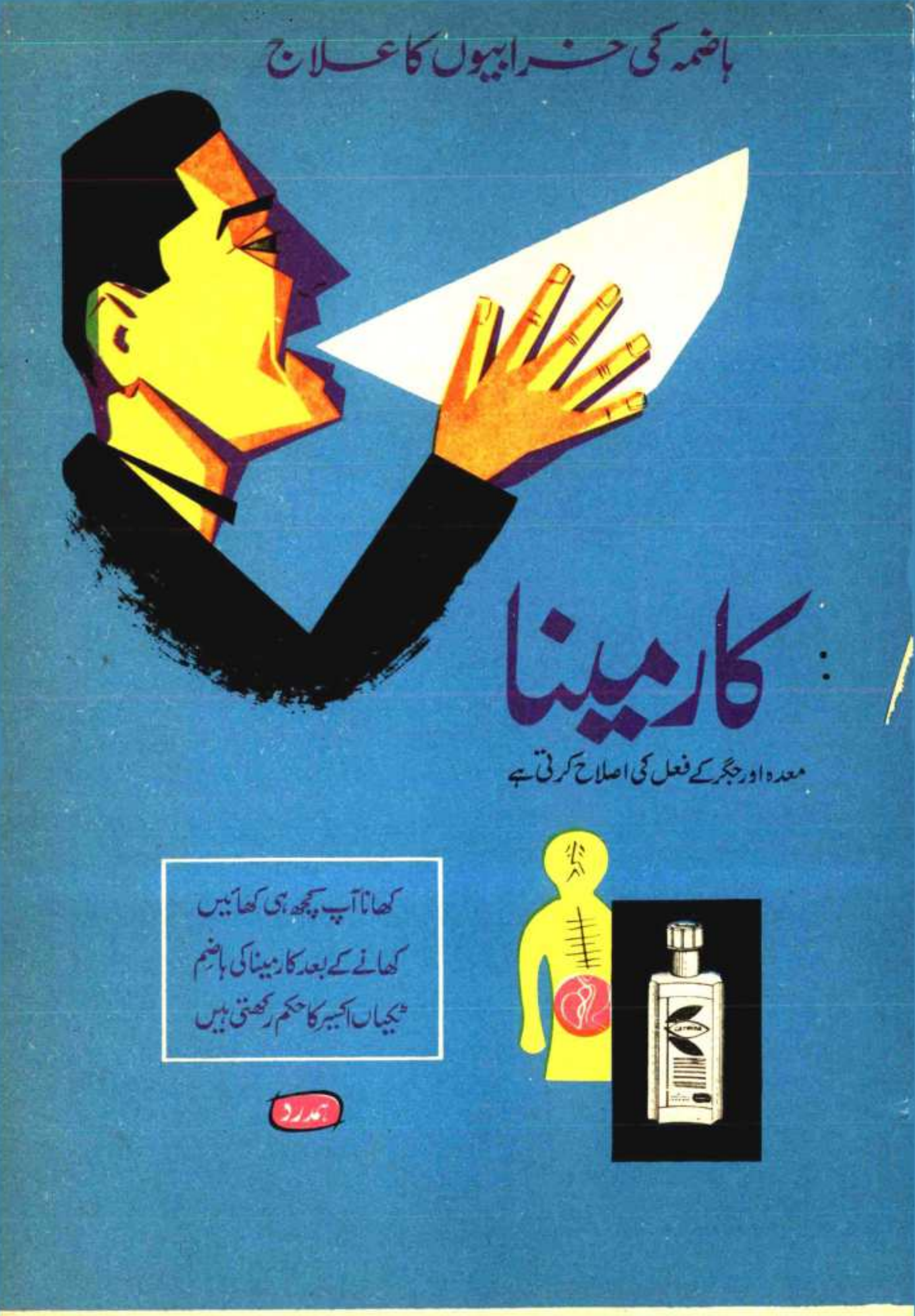
ہرنی کو بُرق پر بڑا ترس آیا۔ اس نے برق کے سر کو محبت سے چاٹنا شروع کر دیا جیسے کہ برق کی ماں کیا کرتی تھی اور پھر بولی، بے چارہ بچہ راستہ بھول گیا۔ اچھا سنو، "تمھارے آنے سے پیشتر میں بھی بڑی اُداس رہا کرتی تھی، کیوں کہ میرا بچہ بڑا ہو گیا ہے اور میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ کاش میرا کوئی چھوٹا سا بچہ ہوتا تو میں اس کی دیکھ بھال کیا کرتی۔ چلو اچھا ہوا کہ تم آ گئے۔ اب میں تمھاری منہ بولی ماں ہوں اور تم میرے بچے ہو۔"

چناں چہ اس دن سے برق اس ہرنی کے پاس رہنے لگا اور ہرنی بالکل ماں کی طرح اس کی دیکھ بھال کرنے لگی۔ برق کئی روز تک ہرنی کے پاس رہا۔ جن ہرنوں کے سینگ تھے، انھوں نے برق کی طرف کوئی توجہ نہ کی، مگر ہرن کے جو چھوٹے چھوٹے بچے تھے وہ برق کے ساتھ کھیلتے رہے اور کلیلیں مارتے رہے۔ برق کو دُور سڑک پر جب کوئی شے چلتی پھرتی دکھائی دیتی تو وہ دوڑ کر جانا چاہتا، کیوں کہ اسے یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید اس کی ماں جا رہی ہو، مگر ہرنی اسے فوراً روک لیتی اور کہتی، "سڑک کے کنارے ہرگز نہ جانا۔ وہاں آدمی ہوتے ہیں اور وہ نہایت خطرناک ہوتے ہیں۔"

اس پر برق کہتا، "نہیں تو، آدمی تو بڑے رحم دل ہوتے ہیں۔ دیکھو میرا مالک کسان تو میرا دوست ہے۔ اس نے تو مجھے کبھی کوئی دکھ نہیں دیا۔ وہ جب میرے اصطبل کے پاس سے گزرتا تھا تو میں اس سے باتیں کیا کرتا تھا۔"

اس پر ہرنی کہتی، "انسان ہمارے واسطے خطرناک ہیں۔ وہ بندوقیں لے کر آجاتے ہیں اور ہمیں مار ڈالتے ہیں۔ تم ہمیشہ ان سے بچنے کی کوشش کرتے رہنا۔ چاروں طرف خوب غور سے دیکھ لیا کرو اور ہوا کو بھی سونگھ لیا کرو۔ یاد رکھو یہ لوگ چپکے سے تمھارے پیچھے آکر تمھیں گولی مار سکتے ہیں۔"

ہرنی چاہے کتنی ہی اچھی چیز کیوں نہ کھا رہی ہو مگر وہ سر اُٹھا کر بار بار چاروں طرف ہمیشہ دیکھتی جاتی تھی۔ اس کے کان برابر ہلتے جُلتے رہتے تھے۔ ذرا سی بھی آہٹ ہوئی اور وہ فوراً چوکنا ہو جاتی تھی اور چوکڑیاں بھرنے کے لیے تیار رہتی تھی۔ ایک دن برق گھاس چرتے چرتے ہرنی


ہاضمہ کی خرابیوں کا علاج
کارمینا
معدہ اور جگر کے فعل کی اصلاح کرتی ہے
کھانا آپ کچھ ہی کھائیں
کھانے کے بعد کارمینا کی ہاضم
ٹکیاں اکسیر کا حکم رکھتی ہیں
ہمدرد



سے ذرا دُور نکل گیا۔ ہرنی پہاڑی پر رہ گئی تھی، مگر وہ برابر برق کو دیکھتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی، "دیکھو، بہت دُور نہ جاؤ، میرے قریب ہی رہو۔"

برق نے کہا، "میں ابھی آتا ہوں۔" اتنے میں اچانک چند ہی گز کے فاصلے پر اُسے ایک آدمی دکھائی دے گیا۔ آدمی نے برق کو نہیں دیکھا، کیوں کہ برق کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ وہ اوندھا لیٹا ہوا تھا اور ایک بڑی سی چٹان کی آڑ لے کر ہرنوں کے جھنڈ کو دیکھ رہا تھا۔ ہرنوں کو اس آدمی کے متعلق قطعی کوئی خبر ہی نہ تھی۔ وہ آرام سے گھاس کھا رہے تھے۔ برق بالکل چُپ چاپ کھڑا رہا اور آدمی کو گھورتا رہا۔ آدمی نے اپنی بندوق اُٹھائی اور ہرنی کا نشانہ لیا۔ برق کے ایال خوف اور غصّے سے اکڑ گئے۔ یہ آدمی تو اس کی منھ بولی ماں کو مارنے والا تھا۔ ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے؟ اگر وہ ذرا بھی ہلتا جُلتا یا آواز نکالتا تو وہ آدمی خود اُسے مار ڈالتا اور اگر خاموش رہتا تو ہرنی کی جان چلی جاتی۔ برق اسی اُلجھن میں تھا کہ اتنے میں دُور سڑک پر اُسے تین گھوڑے دکھائی دے گئے جو کھڑے ہوئے تھے اور جو بظاہر اس بندوق والے آدمی کے منتظر تھے۔ ان میں سے ایک کا رنگ بھورا تھا۔ برق بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ اسے یقین ہی نہ آتا تھا۔ کیا واقعی یہ سچ ہے؟ ہاں وہ اسی کی ماں "صبا" تھی۔

بس پھر کیا تھا۔ برق اس بندوق والے آدمی کو بھی بھول گیا اور باقی باتوں کو بھی بھول گیا۔ اسے تو اب صرف ایک ہی دُھن تھی اور وہ یہ کہ تیزی سے دوڑ کر اپنی ماں کے پاس پہنچ جائے۔ چناں چہ اُس نے اپنا سر اُٹھایا اور بڑے زور سے ہنہنا دیا۔ پھر وہ بولا،

"ماں! میں آ رہا ہوں، میں آ رہا ہوں!" اور اس کے بعد وہ تیزی سے پہاڑی پر سے اُترتا ہوا نیچے چلا گیا۔

برق کے ایک دم ہنہنا دینے سے وہ آدمی ایسا بوکھلایا کہ اس نے بندوق چلا دی، مگر گھبراہٹ میں نشانہ خطا کر گیا اور گولی کسی کے نہ لگی۔ ہرنوں نے اپنے سر اُٹھائے اور ایک سکنڈ کے لیے بندوق کے دھوئیں کو دیکھا، پھر گھوڑے کے بچے کو بھاگتے



ہوئے دیکھا اور اس کے بعد وہ ایسی چوکڑیاں بھرنے لگے کہ ہوا سے باتیں کرنے لگے اور پلک جھپکتے میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ادھر برق تیزی سے دَوڑتا چلا جا رہا تھا۔ آخر کار گرتا پڑتا وہ سڑک پر پہنچ گیا اور اپنی ماں کے پاس آکر رُک گیا۔ ماں اپنے بچے کو دیکھ کر نہال ہو گئی اور خوش ہو کر بولی،

"برق، میرے لاڈلے، اتنے دنوں سے تم کہاں تھے۔ میں تمھارے لیے کتنی پریشان ہو رہی تھی۔ میں تو سمجھی تھی کہ اب شاید ہی تمھیں دیکھ سکوں۔ برق کچھ بول ہی نہ سکا۔ وہ صرف اپنا سر اپنی ماں کے جسم سے رگڑتا رہا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کا دل سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ پھر صبا نے پہاڑ کی طرف دیکھ کر بولا،

"وہ دیکھو، ہرن بچ گئے۔ ہرن جب بچ جاتے ہیں تو مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ تم جب چلائے تو اس سے ہرنوں کو خبر ہو گئی اور اُنھیں بھاگنے کا موقع مل گیا۔" برق نے ہرنوں کو دیکھتے ہوئے کہا،

"ہاں، اب وہ محفوظ ہیں۔ مجھے بھی بڑی خوشی ہے۔ یہ لوگ میرے دوست ہیں۔ انھوں نے میرے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا۔ ان میں سے ایک تو میری منھ بولی ماں بن گئی تھی، مگر میری نظریں تو تمھی کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔"

اس کے بعد وہ اپنی ماں کے ساتھ گاؤں واپس آگیا۔ شام کو کسان آیا اور برق سے کہنے لگا، "برخوردار! تم آگئے۔ کہاں رہ گئے تھے؟" اس کے بعد کسان نے برق کا سر غور سے دیکھا اور بولا، "بڑی حیرت ہے کہ تم اتنے صاف ستھرے ہو۔ اتنی صفائی تو تمھاری ماں بھی شاید نہ کر سکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں خوراک بھی اچھی ملتی رہی۔ معلوم نہیں کس نے اتنی اچھی طرح تمھاری دیکھ بھال کی۔"

برق نے کسان کے ہاتھ پر اپنا منھ رکھ دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسان کو بتا دے کہ یہ ہرن کی محبت تھی، جس کی بدولت وہ اتنا صاف ستھرا اور صحت مند نظر آ رہا ہے، مگر اتنے میں کسان نے اس کا کان پکڑ کر ہلایا اور بولا،

"اب کبھی اس طرح ہرگز نہ بھاگنا۔ آئندہ شاید تم کو ہم لوگ تلاش بھی نہ کر سکیں۔ وہ تو کہو اچھا ہوا کہ میں نے "صبا" کو اپنے شکاری دوستوں کے ساتھ روانہ کر دیا تھا ورنہ آج تمھارا پتہ بھی نہ چلتا۔"



فرانسیسی بغلول کے کارنامے

فہمیدہ اختر

کھا میرے کوٹ، خوب کھا

ایک دن مسٹر بغلول کے گاؤں میں کسی شخص نے دعوت کی اور سارے گاؤں کے لوگوں کو بلایا۔ مسٹر بغلول وقت پر کپڑے پہن کر دعوت میں جانے لگے تو ان کی بیوی نے کہا،

"تم نے اپنا نیا کوٹ کیوں نہیں پہنا۔ یہ کوٹ جو پہن کے جارہے ہو، بہت میلا اور پرانا ہے۔ وہاں سارے گاؤں کے لوگ اچھے اچھے کپڑے پہن کر آئیں گے"۔ بغلول نے کہا،" یہ کوٹ اچھا بھلا ہے۔ کوئی میرے کوٹ کی دعوت نہیں کی ہے۔ میری دعوت ہے۔ کپڑوں سے کیا ہوتا ہے"۔

مسٹر بغلول دعوت میں پہنچے۔ وہاں کسی نے بھی ان کی اچھی طرح آؤ بھگت نہ کی۔ سب لوگ اچھے کپڑوں والوں کی خاطر میں لگے ہوئے تھے۔ بغلول چپ چاپ ایک طرف جا بیٹھے۔

جب کھانا چنا گیا تو بغلول کو کسی نے بھی نہ پوچھا۔ سب اچھے کپڑوں والوں کی خاطر مدارات ہوتی رہی۔ آخر بغلول کو بھوکا ہی گھر واپس آنا پڑا۔ گھر پر بیوی نے پوچھا، "کیسی رہی دعوت؟" انھوں نے بتایا کہ انھیں تو کسی نے پوچھا ہی نہیں۔ بیوی نے کہا، "میں نہ کہتی تھی کہ نیا کوٹ پہن کر جاؤ۔ اب بھی وقت ہے۔ ذرا اپنا نیا کوٹ پہنو اور جا کے دیکھو کہ کیسی خاطر ہوتی ہے۔ پھر دعوت کرنے والوں کو شرمندہ کر کے آنا۔" سمجھ دار بیوی کی یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ بھوک بھی بہت لگی تھی اور گھر میں ان کے حصّہ کا کھانا بھی نہیں پکایا تھا۔ انھوں نے جلدی جلدی نیا کوٹ پہنا اور لپک کر دعوت میں جا پہنچے۔ اب کی بار انھیں دُور سے دیکھتے ہی گھر والوں نے دوڑ کر اُن سے ہاتھ ملایا اور دیر میں آنے کی شکایت کی، پھر بڑی خاطر مدارات سے ان کے سامنے کھانا لا کر رکھا۔

مسٹر بغلول نے پلیٹوں کو سامنے رکھ کر کہنا شروع کیا، "کھا میرے کوٹ خوب کھا!" یہ فقرہ مسٹر بغلول کو ان کی بیوی نے بتایا تھا۔ میزبان بار بار ان کے سامنے کھانے کی چیزیں رکھتے اور وہ یہی کہتے رہے:

"کھا میرے کوٹ خوب کھا!"

میزبان کو اس پر بڑا تعجّب ہوا اور اس نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ آپ خود کچھ بھی نہیں کھا رہے ہیں اور بار بار کہتے ہیں:

"کھا میرے کوٹ خوب کھا!"

اس کا کیا مطلب ہے؟

اب مسٹر بغلول نے میزبان کو بتایا کہ وہ پہلے پُرانا کوٹ پہن کر آئے تھے۔ تو آپ نے یا کسی نے انھیں پہچانا بھی نہیں اور کھانے کو پوچھا تک نہیں۔ اب میں یہ نیا کوٹ پہنے ہوں تو آپ اسی کی خاطر کر رہے ہیں، اس لیے میں اسی کو کھانے کو کہتا ہوں۔ مجھے کھلاتے تو پہلے بھی اسی طرح خاطر کرتے۔ یہ سن کر میزبان بہت شرمندہ

ہوا اور معافی مانگ کر مسٹر بغلول کو خوب کھلا پلا کر رخصت کیا۔ مسٹر بغلول نے گھر آکر بیوی کو سارا حال سنایا اور اس کی سمجھ بوجھ کی تعریف کی۔ بیوی نے کہا، "میں اسی لیے کہتی ہوں کہ انسان دنیا میں رہ کر سب کچھ سوچ سمجھ کر کرے۔"

گدھے کی گولیاں بغلول کے پیٹ میں

ایک دفعہ کیا ہوا کہ مسٹر بغلول کا گدھا بیمار ہوگیا۔ وہ دوڑے دوڑے ڈاکٹر کے پاس گئے اور اس سے دوا مانگی۔ ڈاکٹر نے انھیں گولیاں دیں اور کہا کہ ایک ایک گولی صبح شام کھلا دو۔ بغلول نے کہا، "میں گدھے کو گولی کیسے کھلاؤں گا؟" ڈاکٹر نے ان کو ایک شیشے کی نلکی دی اور کہا کہ ایک گولی اس نلکی میں ڈال دینا اور نلکی کا ایک سرا گدھے کے منھ میں اور دوسرا اپنے منھ میں رکھنا، پھر جلدی سے پھونک مارنا۔ گولی نلکی میں سے نکل کر گدھے کے پیٹ میں چلی جائے گی۔ اس طرح دونوں وقت اسے گولیاں کھلاتے رہنا۔

مسٹر بغلول گولیاں اور نلکی لے کر گھر آگئے اور ڈاکٹر کو دوا کی قیمت دے آئے۔ کئی روز بعد ڈاکٹر ان کے گھر کی طرف سے جا رہا تھا تو اس نے سوچا کہ مسٹر بغلول کے گدھے کا حال معلوم کرتا چلوں۔ جب وہ اندر پہنچا تو دیکھا کہ مسٹر بغلول بستر پر پڑے "ہائے، ہائے" کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے پوچھا، "مسٹر بغلول آپ کب سے بیمار ہیں؟" انھوں نے بتایا کہ جب سے آپ نے میرے گدھے کو گولیاں دیں، اسی روز سے بیمار پڑا ہوں۔ ڈاکٹر نے پوچھا، "آخر آپ کو تکلیف کیا ہے؟" اس پر بغلول نے بتایا کہ "یہ تکلیف تو آپ کی دوا کی بدولت ہے۔ نہ میں اپنے گدھے کے لیے آپ سے گولیاں لیتا اور نہ بیمار ہوتا۔" ڈاکٹر نے پھر حیران ہو کر دریافت کیا کہ ان گولیوں سے آپ کو کیسے بیماری

لگ گئی، مسٹر بغلول نے بتایا کہ "قصہ یہ ہوا کہ میں نے آپ کی بتائی ہوئی ترکیب سے جب گولی نلکی میں ڈالی اور اس کا ایک سرا گدھے کے منھ میں رکھا، پھر اپنے منھ میں دوسرا سرا رکھ کر پھونکنے لگا تو وہ گولی میرے حلق میں چلی گئی اور میں نگل گیا۔" ڈاکٹر نے کہا، "مگر میں نے تو آپ سے کہا تھا کہ نلکی میں گولی رکھ کر پھونک مارنا۔" بغلول نے کہا، "آپ نے تو کہا تھا، مگر نلکی منھ میں رکھتے ہی پہلے میرے گدھے نے پھونک مار دی، پھر میں کیا کرتا۔ اس کے بعد کئی بار میں نے اسی طرح نلکی میں گولی ڈال کر گدھے کو کھلانا چاہی، مگر میرے پھونکنے سے پہلے گدھے نے پھونک ماری اور ساری گولیاں میرے پیٹ میں پہنچ گئیں۔ ان گولیوں کو کھا کر میں بیمار ہوں۔ میرا بُرا حال ہے۔ پیٹ میں سخت درد ہے۔" اور مسٹر بغلول زور زور سے کراہنے لگے۔ ڈاکٹر اُن کی بے وقوفی پر دل میں خوب ہنسا اور اس نے کہا، "گدھے اور انسان کی دوا میں تو بہت فرق ہوتا ہے۔ آپ نے بڑی بے وقوفی کی جو یہ دوا کھالی۔ اب میں اس کا علاج کروں گا، فکر نہ کریں۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد بغلول کی بیوی نے کہا، تم نے مجھے یہ بات پہلے کیوں نہ بتائی۔ بھلا جانور کو بھی کوئی ایسے دوا کھلاتا ہے۔ یہ علاج ہی بے وقوفی کا ہے۔ گدھے کے بدلے تم ہی اس سے بیمار ہوگئے اب میں تمھیں اس کا علاج نہ کرنے دوں گی۔"

مسٹر بغلول نے گنجے پن کی دوا خریدی

ایک بار مسٹر بغلول کے سر کے بال گرنے لگے اور ہوتے ہوتے سارا سر گنجا ہوگیا۔ انھیں بڑی فکر ہوئی کہ اس گنجے پن کا کیا کریں۔ آخر وہ ایک ڈاکٹر کے پاس گئے اور اس سے کہا، "ڈاکٹر صاحب، میرا سر گنجا ہوگیا۔

میں سخت پریشان ہوں۔ بتائیے میں کیا کروں؟"

ڈاکٹر نے کہا، "دس رُپے فیس دو تو میں بتاؤں کیا کرنا ہے؟" مسٹر بغلول نے جلدی سے دس رُپے فیس دے دی۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے کہا، "مسٹر بغلول، گنجے پن کا کوئی علاج نہیں۔ بڑے بڑے فلسفی ڈاکٹر اور پروفیسر گنجے ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی ڈاکٹر کے پاس گنجے پن کی کوئی دوا ہوتی تو وہ پہلے خود اپنے سر کا علاج کرتا، اس لیے آپ کو صبر کرنا چاہیے اور گنجے پن سے پریشان نہ ہونا چاہیے۔"

بغلول نے یہ سن کر ڈاکٹر سے کہا، "تو پھر میرے دس رُپے واپس کر دیں، جو آپ نے علاج کی فیس کے لیے مجھ سے وصول کیے ہیں۔"

ڈاکٹر نے جواب دیا، "میں نے جو فیس لی ہے وہ آپ کے سوال کا جواب دینے کی تھی۔ آپ نے مجھ سے پوچھا تھا، "مجھے کیا کرنا چاہیے، میں سخت پریشان ہوں۔ میں نے آپ کو فیس لے کر اس کا جواب دے دیا کہ آپ کو پریشان نہ ہونا چاہیے۔"

مسٹر بغلول ڈاکٹر کی یہ بات سن کر بہت گھبرائے، مگر لاجواب ہو گئے اور چپ چاپ گھر واپس آ گئے۔ بیوی نے پوچھا، "ڈاکٹر نے سر کے لیے دوا دی؟" بغلول نے سارا حال کہہ سنایا کہ دس رُپے بھی مفت میں گئے اور دوا بھی کوئی نہ ملی۔ سمجھ دار بیوی نے کہا، "کوئی فکر نہیں۔ دس رُپے تو ڈاکٹر سے میں وصول کر لوں گی۔ جو کچھ اُس نے ہمارے ساتھ کیا ہے، ہم بھی اس کے ساتھ ویسا ہی کریں گے۔"

دوسرے دن بغلول کی بیوی نے انھیں چپکے سے کچھ سمجھا کر بازار بھیجا اور بغلول نے ڈاکٹر کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے آواز لگائی، "کوئی بطخیں خریدے گا؟" ڈاکٹر نے یہ آواز سنی اور بغلول کو بلا کر پوچھا، "ایک بطخ کتنے کی ہے؟" بغلول نے کہا، "ایک بطخ پانچ رُپے

کی ہے؟" ڈاکٹر نے کہا، "مجھے چار بطخیں چاہییں۔ یہ لو بیس۲۰ رُپے۔" مسٹر بغلول نے بیس رُپے جیب میں ڈالے اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر نے ان کو پکار کر کہا، "بطخیں کہاں ہیں، چاروں بطخیں کب لا کے دوگے؟" اس پر بغلول نے جواب دیا، "کیسی بطخ، میرے پاس تو کوئی بطخ نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے ان کو تعجب سے دیکھ کر کہا، "ابھی تو تم نے چار بطخوں کی قیمت بیس۲۰ رُپے مجھ سے وصول کیے ہیں۔ تمھارے پاس کوئی بطخ نہیں تو میرے رُپے واپس کرو۔" بغلول نے بیوی کی بتائی ہوئی بات ڈاکٹر کو سنا دی کہ آپ نے مجھ سے سوال کیا کہ بطخ کی کیا قیمت ہے؟ میں نے آپ سے اس کے جواب کی فیس بیس۲۰ رُپے وصول کی۔ اب کس بات کے رُپے واپس کروں۔" ڈاکٹر یہ سن کر لاجواب ہوگیا، کیوں کہ اسے کرنی کا پھل مل گیا اور مسٹر بغلول نے خوشی خوشی اپنی بیوی کو دوگنی رقم جا کر دے دی۔

پڑوسن کا بچّہ تالاب میں

ایک دن مسٹر بغلول کی بیوی کپڑے دھو رہی تھی۔ پڑوسی کے گھر میں ان کا چھوٹا بچّہ رو رہا تھا۔ بغلول اپنے گھر میں بیٹھے بچّے کے رونے کی آواز سن رہے تھے۔ وہ برابر روئے جا رہا تھا۔ اسی دوران میں مسٹر بغلول نے پڑوسن کی آواز سنی، جو بچّے کو ڈانٹ رہی تھی کہ "چپ ہو جا نہیں تو ابھی تالاب میں پھینک دوں گی"۔ اور بچّہ چپ ہونے کے بجائے روتا ہی رہا۔ پڑوسن تھوڑی دیر بعد ان کے گھر آئی اور بغلول کی بیوی سے کہنے لگی کہ "بہن ذرا میرے بچّے کو اپنے پاس رکھ لو یہ بڑا ضدّی ہے۔ مجھے بازار سے سودا لینے جانا ہے۔ اس کے ابا دفتر گئے ہیں۔ میں ابھی واپس آ کر بچّے کو لے جاؤں گی۔"

بغلول کی بیوی نے اپنے میاں سے کہا، "ذرا تم بچّے کو لے لو میں کپڑے دھو رہی ہوں۔" مسٹر بغلول نے بچّے کو گود میں لے کر اپنے پاس بٹھالیا۔ اس کے بعد پڑوسن بازار چلی گئی اور بغلول کی بیوی گھر کے دوسرے کام کاج میں لگ گئی۔

کچھ دیر بعد پڑوسن نے واپس آکر مسٹر بغلول کا شکریہ ادا کیا کہ "آپ نے میرے بچّے کی دیکھ بھال کی۔ آپ کو بڑی تکلیف ہوئی" اور پھر وہاں بچّے کو نہ دیکھ کر اس نے پوچھا، "بچّہ کہاں ہے۔ میں لے جاؤں۔" مسٹر بغلول نے کہا، "وہاں باہر تالاب میں ہے۔" پڑوسن نے تعجب سے کہا، "تالاب میں کیوں گیا؟"

اتنے میں بغلول کی بیوی بھی وہاں آگئی اور بغلول سے بچّے کو پوچھنے لگی۔ بغلول نے کہا، "جب یہ پڑوسن چلی گئیں تو بچّہ رونے لگا میں نے ان کی طرح اسے بار بار کہا کہ چپ ہو جا نہیں تو تالاب میں پھینک دوں گا، وہ پھر بھی چپ نہ ہوا، اس لیے میں اسے تالاب میں پھینک آیا، اور اب وہ وہاں بالکل چپ چاپ [illegible] ہے۔" پڑوسن نے جاکر د[illegible] بچّہ ڈوب بھی چکا تھا۔ اس [illegible] سر پیٹنا اور چیخنا شروع کیا۔ بغلول کی بیوی کو بھی بڑا رنج ہوا، مگر مسٹر بغلول کی اس "عقل مندی" کا علاج بھی کیا ہو سکتا تھا۔

مسٹر بغلول نے مچھلی کا شکار کھیلا

ایک مرتبہ مسٹر بغلول مچھلی کا شکار کھیلنے گئے۔ تالاب میں ڈور ڈال کر بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ کئی گھنٹے گزر گئے، مگر ایک مچھلی بھی نہیں پھنسی۔ ایک شخص اُدھر سے گزرا۔ اس نے بغلول سے پوچھا، "کیوں مسٹر کیا یہ تالاب مچھلیوں کے لیے اچھا ہے؟" بغلول نے جواب دیا، "ہاں، بہت اچھا۔"

اُس نے پوچھا، "تم نے کتنی مچھلیاں پکڑیں؟" بولے، "ایک بھی نہیں۔" اُس نے کہا، "کتنی دیر سے یہاں بیٹھے ہو؟" بولے، "کئی گھنٹے گزر گئے۔" اس نے حیران ہوکر کہا، "پھر تم کیسے کہتے ہو کہ یہ تالاب اچھا ہے، اتنی دیر میں تم نے ایک مچھلی بھی نہیں پکڑی۔" کہنے لگے، "تم نے پوچھا تھا کہ یہ تالاب مچھلیوں کے لیے اچھا ہے۔ میں نے کہا، "ہاں بہت اچھا، کیوں کہ وہ حفاظت سے بیٹھی ہیں اور میرے ہاتھ ایک بھی نہیں پھنسی۔"

مونگ پھلی کھاؤ



مونگ پھلی کھاتے ہوتے کبھی تم نے سوچا کہ مونگ پھلی کیسے اُگتی ہے؟ مونگ پھلی کا مونگ کی دال سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ مٹر اور سیم کی پھلی کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ مونگ پھلی کے پودے پر صبح سورج نکلنے کے ساتھ ہی پھول کھلتے ہیں۔ اگر کھیت میں کھاد وغیرہ ٹھیک طرح ڈالی گئی ہو تو یہ پھول دوپہر تک مرجھا جاتے ہیں۔ پھول مرجھانے کے بعد عین اسی جگہ ایک چھوٹا سا بیج بن جاتا ہے۔ اس بیج کے ساتھ پتلی سی ڈنڈی بھی نکلنی شروع ہو جاتی ہے، جو زمین کی طرف جھکتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہی ڈنڈی اس بیج کو نرم زمین میں دھکیل کر دبا دیتی ہے۔ پھر یہی بیج ریت میں دبے دبے مونگ پھلی کی شکل اختیار کرتا ہے۔ مونگ پھلی کا تیل دنیا کے کئی ملکوں میں غذائی تیل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

عجیب تجویز

(شیکسپیر کے ڈرامہ سے)

قمر حمید



پروٹیا اپنے وقت میں کافی حسین تصوّر کی جاتی تھی۔ پروٹیا کے باپ جارج شہر کے گنے چُنے رئیسوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کی رسائی بادشاہ کے دربار تک تھی۔ دولت مندوں کو فکر سے چھٹکارا کہاں۔ کبھی اس کی فکر میں غرق ہیں کہ کس طرح دولت کو فروغ دیں، کبھی نوکر کے بھاگ جانے کی فکر دامن گیر ہے اور کبھی دشمن کی فکر کھائے جاتی ہے۔ غرض دولت مند ہمیشہ فکروں کے جال میں پھنسے رہتے ہیں۔ جارج کو ان سب کے علاوہ بھی فکر کھائے جارہی تھی، وہ فکر حسین پروٹیا کی تھی۔ جوں جوں وہ جوانی کی حدود میں داخل ہورہی تھی، جارج کی فکر میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اس اکلوتی بیٹی کے لیے، دولت، کوٹھی محلات، کاریں اور نوکر چاکر سب ہی کچھ تو تھے۔ پھر بھی فکر؟ دولت، محلات، کاریں اور نوکر چاکر سے انسان کو اصل خوشی میسّر نہیں ہوتی۔۔ صحیح معنیٰ میں خوشی تو اس وقت ہوتی ہے جب رفیق حیات، ہم سفر سکون بخش ہو۔ جارج کو ایک اچھے داماد اور بیٹی کی آئندہ زندگی کی فکر تھی۔ جارج

اگر چاہتا تو شہزادے لاکھڑا کر سکتا تھا۔ اور پھر پروٹیا کا حسن کچھ کم اثر انگیز نہ تھا۔ اس کے ایک اشارے پر ہزاروں سرنگوں ہو جاتے۔ جارج جانتا تھا کہ دولت سے خریدا ہوا داماد عموماً خراب نکل جاتا ہے اور آئندہ کی خوشیاں میں بدل جاتی ہیں۔ دن رات ایک کرنے بعد اس کے دماغ میں ایک نادر تجویز نے جنم لیا۔ ایک قابل اور لائق داماد کو جیتنے کے لیے تین صندوق بنوائے۔ ایک سونے کا، دوسرا چاندی کا اور تیسرا سیسے کا۔ ان میں سے ایک میں پروٹیا کی تصویر رکھدی۔ جارج نے شہر میں اعلان کرا دیا، جو شخص ایسا صندوق پسند کرے گا، جس میں پروٹیا کی تصویر ہے تو اس کے ساتھ پروٹیا کی شادی کردی جائے گی، لیکن غلط پسند پر تمام عمر شادی سے محروم کر دیا جائے گا۔ جارج نے اس شرط کے دستاویز بادشاہ سے منظور کرا لیے۔

پروٹیا کے حسن کا چرچا دُور دُور تک پھیلا تھا۔ اعلان سنتے ہی لوگ بڑی تعداد میں آنا شروع ہوئے۔ یکے بعد دیگرے سب کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ ایک شہزادہ "ٹروکو" سے آیا۔ اس نے سونے کا صندوق پسند کیا۔ کھولا تو اس میں سے ایک مردے کی تصویر نکلی۔ بے چارہ افسردہ خاطر گھر واپس ہوا۔ پھر ایک شہزادہ "اسپین" سے آیا۔ اس نے چاندی کا صندوق چنا، جب اسے کھولا تو اس میں سے ایک احمق کی تصویر نکلی۔ وہ غمگین گھر لوٹا۔

پینو اپنے دوست گریٹینو کے ساتھ آیا۔ پروٹیا نے ان کا خیر مقدم بڑے جوش کے ساتھ کیا، کیوں کہ وہ عاشقوں کی نسبت پینو کو زیادہ چاہتی تھی اور پروٹیا کی سب سے بڑی خواہش پینو سے شادی کرنے کی تھی۔

پینو کے سامنے سونے چاندی اور سیسے کے صندوق رکھے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ ان میں سے کس کا انتخاب کرے۔ ہزاروں ناکام لوگوں کی تصویر اس کے ذہن میں اُبھری پھر اپنا انجام سامنے آیا اور خوف سے دل دھڑکنے لگا۔ پینو نے سونے اور چاندی کے صندوق کو چھوا تک نہیں، کیوں کہ بداخلاق اشخاص اس کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ سونا چاندی، جس کے پاس ہو اس کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے، رات کی نیند دن کا چین اسی کی بدولت جاتا رہتا ہے۔ اسی کی بدولت لوگوں میں تکبّر و غرور کا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے، اسی کی

(باقی صفحہ ۴۴ پر)



ہمارے ارادے

انور افسر شعور



نہ پڑھائی میں دل لگائیں گے
نہ شرارت سے باز آئیں گے

چھوٹے بچوں کو منھ چڑائیں گے
ہر طرح سے انھیں ستائیں گے

جو بتائیں گے ماسٹر صاحب
پہلی فرصت میں بھول جائیں گے

باجیوں کے دماغ چاٹیں گے
اور امّی کا سر بھی کھائیں گے

شیطنت کا مقابلہ ہو تو
حضرت ابلیس ہار جائیں گے

کبھی ٹَن ٹَن کبھی جھَنن جھَن جھَن
ہر طرح شور غل مچائیں گے

ماسٹر صاحبوں سے پٹ پٹ کر
حوصلے اُن کے آزمائیں گے

سخت سے سخت تر پٹائی پر
ایک آنسو نہیں بہائیں گے

کھیلنے کودنے کے موقعوں پر
بے بلائے ہوئے بھی جائیں گے

دل میں ہیں بے شمار منصوبے
اور تفصیل کیا سنائیں گے

لیکن آؤ ذرا قریب آؤ
راز کی بات اب بتائیں گے

کہ ہم اپنے انھی ارادوں پر
روز بے ناغہ مار کھائیں گے

SAMI.64

جھوٹ نہیں سچ

عشرت رحمانی



ایک شخص بازار جا رہا تھا۔ بیوی کو بکری پالنے کا شوق تھا۔ اس نے میاں سے تقاضا کیا کہ میں کئی روز سے کہہ رہی ہوں، آج میرے لیے بکری ضرور خرید کر لانا۔ میاں نے وعدہ کر لیا کہ میں سب سے پہلے تمھاری بکری کا انتظام کروں گا۔ جاتے جاتے ان کا کم سِن لڑکا ضِد کرنے لگا کہ ابا میں بھی بازار چلوں گا۔ باپ نے اُسے بہلانے کے لیے ٹالا کہ بیٹے، میں بکری لینے جا رہا ہوں۔ عمدہ سی بکری لاؤں گا۔ پھر اسے ذبح کریں گے اور اُس کے گوشت کے کباب بنا کر خوب بھُون بھُون کر کھائیں گے۔ بچّے نے ایک نئی بات سُنی اور پوری بکری کھانے کے شوق میں خوش ہو کر باپ کی بات مان لی اور خاموش ہو کر کھیل کود میں مصروف ہو گیا۔ وہ شخص چلا گیا۔ اُس کے چلے جانے کے بعد بچّہ کھیلتے کھیلتے ماں کے پاس آیا اور خوش ہو کر تالیاں بجانے لگا اور کہنے لگا، "امّی! ابّا آج میرے لیے بکری لائیں گے۔" ماں نے ہنس کر دل لگی سے کہا، "تمھارے لیے نہیں، میرے لیے لائیں گے۔" بچّے نے کہا، "نہیں، وہ تو میرے لیے لائیں گے اور اس کا گوشت ہم خوب بھُون بھُون کر کھائیں گے۔" ماں نے اب اس کی بات سُن کر غور کیا اور بولی، "نہیں بیٹے، اس کا گوشت نہیں کھائیں گے۔ وہ دودھ دے گی۔ تم روزانہ اس کا دُودھ پینا۔" بچّہ ماں کی اس بات پر منھ بسورنے لگا

اور بولا" اُوں، ہم تو دودھ نہیں پییں گے۔ اس کا گوشت بھونیں گے اور ہم آپ کو بھی دیں گے۔"

ماں نے اُسے بہلانے کو کہہ دیا" اچھا اچھا، جو جی چاہے کر لینا۔" بچّہ پھر خوشی خوشی کھیلنے لگا، مگر اس کی ماں لگاتار سوچتی رہی۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ بچّے کے سامنے جھوٹ بولا جائے۔ اس نے سوچا کہ اگر بکری کو ذبح کر کے باپ کو سچّا بنائیں اور بچّے کے سامنے جھوٹ نہ بولا جائے تو اچھا خاصا نقصان ہوگا اور اگر بکری ذبح نہ کریں تو بچّہ سمجھے گا کہ میرے ابّا جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ اسی سوچ بچار میں تھی کہ بچّے نے پھر آکر پوچھا، "کیوں امّی، بکری کے کباب ہم کھائیں گے نا؟" ماں نے کہا" ہاں بیٹا، ضرور کھائیں گے۔" بچّہ خوش ہو کر ناچنے کودنے لگا اور بولا" امّی، وہ تو بہت بڑی ساری ہوگی۔ آپ بھی کھائیں گی، ابّا بھی کھائیں گے اور محلّے کے لوگوں کو بھی دیں گے۔" ماں نے کہا" ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ ایسا ہی کریں گے۔" اتنے میں وہ شخص آگیا اور ہاتھ میں بکری کی رسّی پکڑ کر اندر داخل ہوا۔ اس کے لڑکے نے دیکھتے ہی تالیاں بجائیں اور خوشی سے خوب ناچا۔ پھر بکری کے سر اور کمر پر ہاتھ پھیرنے لگا اور اس کے کان کے قریب منھ رکھ کر کہنے لگا" بکری جی، تم بہت اچھی ہو۔ ہمارے ابّا کے ساتھ ہمارے گھر آگئی ہو۔ اب ہم تمھیں ذبح کریں گے اور تمھارا گوشت بھون بھون کر کھائیں گے۔ محلے والوں کو بھی کھلائیں گے۔" اس کا باپ یہ سن کر ہنسنے لگا اور بولا" نہیں بیٹے، یہ تو تمھاری امّی نے پالنے کو منگوائی ہے۔ اسے دانہ کھلائیں گے، پھر یہ خوب موٹی تازی ہو جائے گی۔ بہت سا دودھ دے گی۔ تم روزانہ اس کا دودھ پینا اور محلّے والوں کو بھی پلانا۔" بچّے کو باپ کی یہ بات سن کر تعجّب ہوا۔ پہلے تو وہ خاموش اور اداس ہو کر باپ کی طرف تکتا رہا، پھر بولا" مگر آپ تو کہہ رہے تھے کہ تمھارے لیے لائیں گے اور اس کا گوشت بھون کر کھائیں گے۔" باپ ہنسنے لگا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔ بچّے نے پھر پوچھا" تو ابّا آپ اسے ذبح نہیں کریں گے؟" باپ نے جواب دیا" نہیں بیٹے۔" بچّے نے کہا" تو ہم اس کا گوشت بھی نہیں کھائیں گے؟" باپ نے کہا" نہیں بیٹے، ایسا نہیں کہتے۔" بچّے نے ٹھنک کر کہا" تو پھر آپ نے کہا کیوں تھا۔" اتنے میں ماں بھی وہاں آگئی اور اس نے بھی اپنے میاں سے وہی سوال کیا کہ آپ بچّے سے کیوں کہہ گئے تھے کہ تمھارے لیے بکری لاؤں گا اور اُسے ذبح کر کے کھلاؤں گا"؟

باپ نے قہقہہ لگایا اور کہنے لگا" تم بھی بچّے کی سی باتیں کرنے لگیں۔ میں نے تو یونھی اُسے

بہلانے کے لیے کہا تھا۔" ماں نے کہا۔" تو آپ نے بچّے سے جھوٹ بولا تھا۔" باپ نے کہا،" بھئی اس میں جھوٹ سچ کی بات کیا ہے۔ میں نے تو ٹالنے کو ایک بات کہی تھی۔" ماں نے بڑی سنجیدگی سے کہا، "مگر آپ نے یہ نہیں سوچا کہ آپ بچّے سے جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ وہ بھی ایسی باتوں کا عادی بنے گا اور ٹالنے کے لیے جھوٹ بولنا سیکھے گا۔ یہ تو بہت بُری بات ہے نا۔"

بیوی کی باتیں سُن کر میاں پھر ہنسنے لگا، مگر بیوی نے قطعی فیصلہ کرتے ہوئے کہا،" یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم بچّے کی ضد کو ٹالنے اور اسے بہلانے کے لیے جھوٹ نہیں بولیں گے۔ جو کچھ تم نے کہا ہے، ہمیں وہی کرنا چاہیے۔" میاں نے حیران ہو کر کہا،" کیا کہہ رہی ہو؟ ہم اس کو ذبح کر ڈالیں؟" بیوی بولی، "یقیناً ہم اسے ذبح کریں گے، جو کچھ آپ نے کہا ہے، اسے سچ کر کے دکھانا ضروری ہے۔ ہم اس کی عادت نہیں بگاڑیں گے۔ ہم اس کے سامنے جھوٹ نہیں بولیں گے۔ اگر بکری ذبح نہ ہوئی تو وہ آپ کی بات کو کبھی سچ نہ مانے گا۔" اور اس نے بچّے سے کہا، "ننھے، ابھی تمھارے ابا بکری ذبح کریں گے اور اس کا گوشت ہم سب مزے سے کھائیں گے۔ تمھارے ابا سچ کہتے تھے۔" بچہ خوش ہو کر تالیاں بجانے لگا، "اہا جی آہا ہمارے ابا سچ کہتے تھے!" اور باپ گہری سوچ میں پڑ گیا۔

اس کے بعد بیٹے نے باپ سے پوچھا، "ابا، بکری کب ذبح کریں گے؟" تو اس نے بڑے پیار کے لہجے میں جواب دیا، "بیٹا، بس ابھی ذبح کریں گے۔" بیٹے نے تالیاں بجا کر خوشی سے کہا،" سچ مچ آہاہا!"

بقیہ "عجیب تجویز"

بدولت آپس میں لڑائی جھگڑا ہوتا ہے۔ پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ نتیجے کے طور پر ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ پھر وہ دنیا میں "بداخلاق، کنجوس ان ہی سب ناموں سے پکارے جاتے ہیں اس لیے اُس نے سیسے کا صندوق اٹھالیا۔ جب اسے کھولا تو اس میں پروٹیا کی مسکراتی ہوئی تصویر نکلی۔ بینو، خوشی سے چیخ اٹھا۔ اب وہ پروٹیا سے شادی کرے گا۔

مقررہ تاریخ کو ان کی شادی اس شان و شوکت سے ہوئی، جس کی مثال اب بھی دی جاتی ہے۔



سعالین
سُعالین
ہمدرد

اخبار نونہال

اکثر بڑے لوگوں کا بچپن مصیبتوں میں گزرا

جلد ہی برطانیہ میں ایک کتاب "عظمت کے گہوارے" شائع ہونے والی ہے، جس میں ایک امریکی تحقیقاتی ماہر نفسیات وکٹر جیور ٹسزل اور اُس کی بیوی نے بیسویں صدی کے ۴۰۰ مشہور مردوں اور عورتوں کے بچپن کے حالات کی چھان بین کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں جتنی زیادہ سختیاں پیش آئیں گی، وہ لڑکی یا لڑکا اتنی ہی زیادہ ترقی اپنی آئندہ زندگی میں کرے گا۔ ہٹلر جسے اس کی ماں نے بگاڑ دیا تھا، اپنی نوجوانی کے زمانے میں اتنا الگ تھلگ رہتا تھا کہ اس نے خودکشی کرنے کے بارے میں غور کیا تھا۔ ماؤزے تنگ اپنے والد سے بُری طرح لڑتا تھا۔ اس نے ڈوب کر خودکشی کر لینے کی دھمکی دی تھی اور اس نے ایک مندر میں آگ لگا دی تھی، جس میں اس کا باپ عبادت کرتا تھا۔ مسولینی کا کبھی کوئی دوست نہیں بنا۔ اس کا باپ اسے خوب پیٹا کرتا تھا۔ ان دونوں مصنّفوں نے لکھا ہے کہ دو تہائی بڑے لوگوں کا بچپن بڑی پریشانی میں گزرا۔ ان میں سے بہت سے لوگ غریب تھے یا وہ اسکولوں میں ناکام رہے تھے یا پھر جسمانی خامیوں میں مبتلا تھے۔

پرندوں کا اسکول

آسٹریلیا کی ریاست وکٹوریہ میں الامبی ساوتھ کے مقام پر ایک چھوٹا سا دیہاتی اسکول ہے، جس میں صرف ۹ بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں، مگر ان بچوں نے اپنے اسکول کے لیے ایک ایسے مقابلے میں شریک ہو کر انعام حاصل کیا جس میں ۸۹۰، اسکولوں کے ۲۹۶۷۵ بچوں نے حصّہ لیا تھا۔ یہ انعام پرندوں کی دیکھ بھال کے کلب کی طرف سے ان کو دیا جاتا ہے جو پرندوں کی بابت سب سے زیادہ جانتے ہوں۔ اِن ۹ طلبا نے ایک کتاب میں تفصیلات جمع کیں۔

دُودھ کی طاقت

ہر انسان اپنے بچپن میں ایک خاص عرصے تک دودھ پر ہی زندہ رہتا ہے۔ تمام دودھ پینے والے جانداروں میں دودھ خوراک کے معاملے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور بچوں کی پرورش کے لیے اس سے بہتر کوئی دوسری غذا نہیں ہے۔ یہ دماغ کو تقویت پہنچاتا ہے، پٹھوں اور ہڈیوں کو مضبوط بناتا ہے۔ بچوں کے لیے کوئی خوراک دُودھ کا بدل نہیں ہے۔ نوجوانوں اور بڑے لوگوں کے لیے بھی دودھ اور اس سے بنائی ہوئی دوسری چیزیں اہم غذائی حیثیت رکھتی ہیں۔



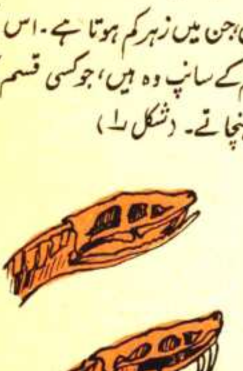
ہر انسان کو دُودھ کی ضرورت ہوتی ہے، کیوں کہ یہ رگ پٹھوں کو بناتا ہے۔ جسم میں گرمی اور چستی پیدا کرتا ہے۔ جسم کے اندر فاضل چربی جمع کر دیتا ہے۔ اس تصویر میں بتایا گیا ہے کہ حراروں (کیلوریز) کے لحاظ سے ایک کوارٹ (چوتھائی گیلن) دودھ کی طاقت دوسری چیزوں کے مقابلے میں کتنی ہوتی ہے۔ دودھ جسم کو بنانے میں خاص طور پر مدد کرتا ہے۔ اس کی وجہ لحمیات PROTEIN ہیں۔ لحمیات اس میں کافی ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ دودھ دیر میں بھی ہضم نہیں ہوتا۔

کچھ سانپوں کے متعلق



ریگستان کی سفید چمکتی ہوئی ریت سے لے کر ہرے بھرے جنگلوں تک، زمین میں بلوں سے لے کر سمندر کے پانی تک سانپ ہی سانپ پائے جاتے ہیں۔ چھوٹے بڑے، پتلے نازک، موٹے بدّھے، زہریلے اور بغیر زہر کے، ان سانپوں سے کوئی بھی جاندار محفوظ نہیں۔ یہاں تک کہ وہ سانپ بھی محفوظ نہیں ہیں، جو ایک دوسرے کو کھا جاتے ہیں۔

اب تک دنیا میں تقریباً ۱۶۰۰ قسم کے سانپ دریافت ہوئے ہیں۔ ان میں سے ۵۰ قسم کے سانپ وہ ہیں، جو سمندر میں پائے جاتے ہیں اور بہت زہریلے ہوتے ہیں۔ زمین پر جو سانپ رینگتے پھرتے ہیں وہ ۲۵۰ قسم سے زیادہ کے نہیں ہوتے۔ ان میں سے بھی ۱۵۰ قسم کے سانپ وہ ہوتے ہیں، جن کا زہر بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ تین سو قسمیں ایسی ہوتی ہیں، جن میں زہر کم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک ہزار قسم کے سانپ وہ ہیں، جو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتے۔ (شکل ۱)



شکل (۱)

ان رینگنے والے سانپوں کے پپوٹے نہیں ہوتے، اس لیے وہ اپنی آنکھیں بند نہیں کرسکتے۔ آنکھوں پر ایک شفاف موٹی سی جھلّی ہوتی ہے، جو آنکھوں کی پتلیوں کی حفاظت کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سانپ کی آنکھوں میں ایک خاص کشش پیدا ہوجاتی ہے، جس سے وہ اپنے شکار پر اثر ڈالتا ہے۔ سانپ اپنی پسلیوں سے چلتا ہے، یعنے رینگتا ہے۔ سانپ کے بہت سی پسلیاں ہوتی ہیں اور یہ سب ریڑھ کی ہڈی سے جڑی رہتی ہیں۔ پیٹ کے نیچے مضبوط پٹھوں سے یہ پسلیاں ملی رہتی ہیں اور یہ ہی اس کے پاؤں ہوتے ہیں، جن سے سانپ رینگتا ہے۔

سانپوں کی دو شاخہ جیسی زبان بالکل بے خطر ہوتی ہے۔ البتہ ان کے اندر کی طرف جھکے ہوئے دانت بہت خطرناک ہوتے ہیں، جو انجکشن کی سوئی کی طرح تیز ہوتے ہیں اور جن میں سے زہر فوراً زخم میں پہنچ جاتا ہے۔ جب منھ بند ہوتا ہے تو یہ اندر کی طرف آڑے ہوجاتے ہیں۔ سانپ کا جبڑا بڑی تیزی سے کھلتا اور بند ہوتا ہے اور یہ دانت بھی اپنا کام ساتھ ساتھ کرتے ہیں۔ ایک لیور (LIVER) کے ذریعہ وہ جتنا چاہتا ہے اپنا منھ کھول لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سانپ اپنے جسم سے زیادہ موٹی چیز نگل جاتا ہے۔ سانپ پہلے اپنے شکار کو منھ کے لعاب سے چکنا کرلیتا ہے اور پھر نگلنا شروع کردیتا ہے۔ اندر کی طرف مڑے ہوئے دانت نگلنے میں مدد دیتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ جھٹکے دے کر حلق میں نگل جاتا ہے۔ سانپ کے چوں کہ ہاتھ یا پنجے نہیں ہوتے، اس لیے کھانے میں دیر لگتی ہے۔ سانپ جیسے ہی کاٹنے کے لیے اپنا منھ کھولتا ہے، اس کے دانت ایک دم سیدھے ہوجاتے ہیں۔ یہ سب کچھ نہایت تیزی سے خود بہ خود ہوجاتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوجاتا ہے کہ کسی نے لڑاکا ہوائی جہاز کا بٹن دبا دیا اور گولیوں کی بوچھاڑ شروع کردی۔ زہر فوراً خون میں تیزی سے مِل جاتا ہے۔ مختلف سانپوں کے زہر کی تیزی کا اثر جس قسم کا سانپ ہوتا ہے، اسی اعتبار سے ہوتا ہے۔

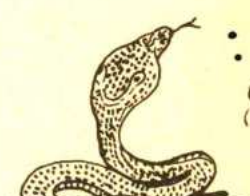
رسل وائپر (RUSSEL'S VIPER) قسم کے سانپ کے کاٹنے کے بعد خون میں پھٹکیاں بن جاتی ہیں اور وہ دورانِ خون کو روک دیتی ہیں۔ (شکل نمبر ۲)

کالا ناگ، کابرا (COBRA) اس کا زہر



شکل
(۲)

خون میں فوراً اثر کرتا ہے اور دماغ کے اس حصّہ کو جس سے تنفّس کا تعلق ہے، مفلوج کر دیتا ہے، یعنے اس پر فالج کا اثر ہو جاتا ہے۔ زہر کا اثر انسان اور حیوان دونوں پر یکساں ہوتا ہے۔ کالے ناگ کے کاٹے ہوئے زخم میں بہت جلن ہوتی ہے۔ (شکل نمبر ۳)

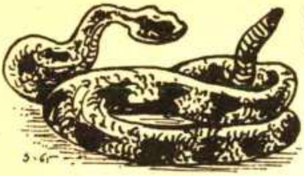


شکل
(۳)

سمندری سانپ کے زہر کا اثر کالے ناگ سے پچاس گنا زیادہ ہوتا ہے۔

ریٹل سانپ (RATTLE SNAKE) کے زہر سے بھی پھٹکیاں بن کر دوران خون رکتی ہیں اور سانس گھٹنے لگتی ہے۔ غشی کے دورے پڑتے ہیں۔ (شکل نمبر ۴)

وائپر (VIPER) رٹلس (RITTLES)



شکل
(۴)

اور کاپر ہیڈ (COPPERHEAD) ان چھوٹے سانپوں سے انسان ڈرتا ہے اور اکثر جب یہ سانپ خوب پیٹ بھر کر گہری نیند سوتے ہیں ان پر اگر کسی کا پیر پڑ جائے تو یہ سانپ اپنی مدافعت میں حملہ کرتے ہیں۔ ہر سانپ کا رنگ و روپ اُس ماحول کے مطابق ہوتا ہے، جس میں وہ رہتا ہے، تاکہ اپنے دشمنوں سے محفوظ رہے اور شکار پکڑتے وقت آسانی سے پہچانا نہ جاسکے۔

بوآ (BOA) غور سے دیکھیے کہ اِس بڑے سانپ نے کس طرح اپنی دم کو درخت کے تنے سے لپیٹ کر ایک سور کو جکڑ رکھا ہے، اس کے چاروں طرف اپنی گرفت مضبوط کر رکھی ہے، تاکہ اس طرح وہ اس کی ہڈّی پسلیاں ایک کردے اور جب وہ پلپلا ہو جائے تو اس کو نگل جائے (شکل نمبر ۵ و ۶)

پائتھان (PYTHON) بوا (BOA) اور آمیزان آناکنڈا (AMAZON ANACONDA)

شکل (۵)



شکل (۶)



یہ سب سانپ یہی طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ امیزان آناکونڈا چالیس فیٹ تک لمبا اور شراب کے پیپے کی طرح موٹا ہوتا ہے۔ یہ جھیلوں کے پانی اور درختوں اور جھاڑیوں کے پاس چھپا رہتا ہے۔ (شکل نمبر ۷)

شکل (۷)



اب کچھ ان کے متعلق بھی سن لیجیے،

جو چھوٹے سانپوں کو مار کر کھا جاتے ہیں۔ ان چھوٹے بے ضرر سانپوں کو اکثر جانور اور پرندے کھا جاتے ہیں اور زہریلے سانپوں پر خاص ترکیب اور ہشیاری سے حملہ کرتے ہیں۔

نیولا۔ (شکل نمبر ۸)

ہیج ہاگ (HEDGE HOG) (شکل نمبر ۹)



شکل (۸)



شکل (۹)

کنگ فشر (KINGFISHEIR) (شکل نمبر ۱۰)
سیکریٹری پرندہ (SECRETARY BIRD)
شکل نمبر (۱۱)



شکل (۱۰)



شکل (۱۱)

• اور کئی قسم کی چیلیں، شکرے ہر وقت ان سانپوں سے نبٹتے رہتے ہیں۔ یہ پرندے اور جانور بھی زہر سے محفوظ نہیں ہوتے۔ اصل میں وہ سانپ کو موقع دیتے ہیں کہ وہ خوب جی بھر کر ان کے بال اور پر کاٹے اور اس طرح تھک جائے اور کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا سکے۔ سانپ کا اندھا دھند منھ مارنا اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ بلکہ اس حرکت سے دوسرے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کو اپنے پروں اور بڑے بالوں پر خوب منھ مارنے دیتے ہیں اور پھر بجلی کی سی تیزی سے اس کو لقمہ بنا کر ہڑپ کر جاتے ہیں۔

خطرہ کون مول لے؟

جب کرکٹ کی گیند میری طرف اڑتی ہوئی آئی تو میرے دماغ نے میرے جسم کو فوراً پیغام بھیجا، "دوڑو، پکڑو" پھر میرے جسم نے میرے دماغ کی طرف پیغام بھیجا، "یہ خطرہ کون مول لے، میں یا تم؟" اتنے میں گیند نکل گئی۔ تماشائی قہقہے لگانے لگے اور میں نے کرکٹ کھیلنا ترک کر دیا۔ (ع۔خ)

صحت مند نونہال



کامران شفیق ، کرا

اس صفحہ پر ہر ماہ صحت مند نونہالوں کی تصویریں شائع کی جائیں گی۔ جلدی سے اپنی تصویر بھیج دو!



محمد حنیف عمر ، کراچی



میر سہیل ، راولپنڈی



شوکت میاں ممتاز، جھنگ



زاہد رضا، دیناج پور



سید خالد حسین، کراچی ۔ شعیب احمد فاروقی



سفاقت علی یا پیو



نوشین زہرہ، کراچی



گرگٹ

• گرگٹ (CHAMELEON) اپنے جسم کا رنگ بدلنے کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ ابھی سبز نظر آرہا ہے، ابھی ایک دم سلیٹی رنگ کا ہو گیا، پھر پیلا اور دھبّے والا نظر آنے لگا۔ اپنے ماحول کو دیکھ کر یہ رنگ بدلتا ہے اور ویسا ہی نظر آنے لگتا ہے۔ گرگٹ چوں کہ بہت آہستہ چلتا ہے، اس لیے قدرت نے اسے رنگ بدلنے کی قوت عطا کی ہے، تاکہ وہ ان سانپوں اور پرندوں سے محفوظ رہ سکے، جو اس کے دشمن ہیں۔ گرگٹ کی جلد کے نیچے ایسے خلیات (سیلز) ہوتے ہیں، جو نظامِ عصبی کی مدد سے جلد کو سکیڑتے اور پھیلاتے رہتے ہیں اور اسی سبب سے اس کے رنگ میں تبدیلی ہوتی ہے۔ رنگ بدلنے کی خصوصیت کے علاوہ بھی گرگٹ عجیب و غریب جانور ہے۔ اس کی آنکھیں پپوٹے سے ڈھکی رہتی ہیں۔ پپوٹے میں ایک سوراخ ہوتا ہے اور پپوٹا گھومتی پھرتی آنکھوں کے ساتھ حرکت کرتا رہتا ہے۔ سب سے حیرت کی بات یہ ہے کہ گرگٹ اپنی ایک آنکھ سامنے بیٹھی ہوئی مکھی کی طرف جما سکتا ہے اور دوسری آنکھ سے اپنا کندھا دیکھ سکتا ہے، یعنی وہ بھینگا بن سکتا ہے۔ دوسری عجیب بات یہ ہے کہ قدرت نے اسے بہت لمبی زبان دی ہے، جو اس کی لمبائی کی آدھی ہوتی ہے۔ گرگٹ بجلی کی سی تیزی سے زبان منھ سے نکال کر اس کے لیس دار سرے سے کیڑے پکڑ لیتا ہے۔ قدرت نے اس کی سُست رفتاری کی کمی پوری کرنے کے لیے ایسی زبان دی ہے۔

گرگٹ پچاس قسم کے ہوتے ہیں، جو افریقہ اور دنیا کے دوسرے علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس کی لمبائی عموماً ٦۔ اِنچ ہوتی ہے اور اتنی ہی لمبی اس کی دُم ہوتی ہے، جس کی مدد سے وہ درختوں کی شاخوں سے لپٹ کر شکار کرتا ہے۔



گھونگا

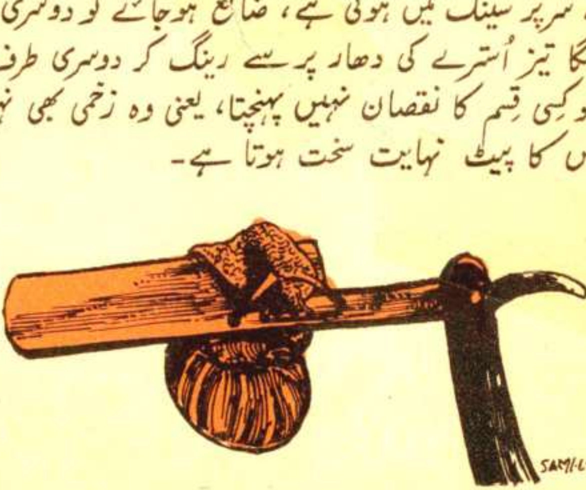
کھونگے دُو قسم کے ہوتے ہیں، ایک خول کے اندر ہوتا ہے اور دوسرا بغیر خول کے۔
جو گھونگے خول میں رہتے ہیں، وہ اپنے جسم کو اس کے اندر بند کر لیتے ہیں۔
ان کے جسم پر مضبوط پٹھے ہوتے ہیں اور ان کی مدد سے وہ خطرے کے
وقت خول کے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔

بعض گھونگوں کے پیر میں ایک گُھردرا گول چکّر ہوتا ہے اور اس سے وہ اندر
بند ہونے کے بعد اس سوراخ کو بند کر لیتے ہیں، جس سے وہ داخل ہوئے تھے۔
دوسری قِسم کے گھونگے سُوراخ کو لیس دار چکنی چیز سے بند کر دیتے ہیں اور
اِس طرح بند ہو کر وہ گرم موسم اس کے اندر گزار دیتے ہیں۔ گھونگے نمکین
پانی، صاف پانی اور زمین پر بھی رہتے ہیں۔ یہ پودوں پر زندہ رہتے ہیں اور
بعض گھونگے گوشت بھی کھاتے ہیں۔ گھونگے کے منھ میں فیتے نما دندانے دار ریتی
جیسا آلہ ہوتا ہے۔ اس کی مدد سے وہ کھانے کے باریک ٹکڑے کر دیتا ہے ——
اس کی آنکھیں ان دُو لمبے سینگ جیسے حصّوں پر ہوتی ہیں، جو سر کے اوپر ہوتے
ہیں، یا پھر چھوٹے سینگ والے حصوں پر ہوتی ہیں۔ دونوں قِسم کے گھونگے، جو
پانی میں یا زمین پر رہتے ہیں، سانس لیتے ہیں اور ان کو پلمونیٹ
(PULMONATE) گھونگے کہا جاتا ہے۔ ان کے پھیپھڑے بالکل سادہ جھلی کی تھیلی

کی طرح ہوتے ہیں اور وہ بجائے دُم کے جسم کے درمیان میں سر کے پاس ہوتے ہیں۔ جو گھونگے پانی میں سانس لیتے ہیں، اُن کے پتّے جیسے نازک گلپھڑے ہوتے ہیں اور ان سے صاف پانی ٹکراتا رہتا ہے اور اس میں سے خون آکسیجن حاصل کرتا ہے۔ بڑے گھونگے، جو نمکین پانی میں سمندر کے اندر رہتے ہیں، اِسی طرح سانس لیتے ہیں۔ گھونگے اپنے انڈے عجیب و غریب چھوٹے خولوں میں رکھتے ہیں۔ گھونگے ہمیشہ اپنے چپٹے پیٹ کے بَل رینگتے ہیں۔ اسی کو ان کے پَیر کہا جاتا ہے اور ان میں سے ایک قسم کا لیس نکلتا ہے، جس سے وہ آسانی سے پھسل سکتے ہیں۔

گھونگوں کو اپنا گھر معلوم کرنے میں بڑی مہارت ہوتی ہے اور وہ محفوظ جگہ فوراً پہنچ جاتے ہیں۔

ایک چھوٹے گھونگے کا وزن آدھے اونس سے کم تھا، مگر اس نے صاف چکنی ٹیبل پر آدھے پونڈ وزن کی چیز آسانی سے کھینچ لی۔ گھونگے کی ایک آنکھ جو اس کے سر پر سینگ میں ہوتی ہے، ضائع ہو جائے تو دوسری نئی نکل آتی ہے۔ گھونگا تیز اُسترے کی دھار پر سے رینگ کر دوسری طرف جا سکتا ہے اور اس کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا، یعنی وہ زخمی بھی نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اس کا پیٹ نہایت سخت ہوتا ہے۔



بے احتیاطی، حادثہ کا سبب بن سکتی ہے





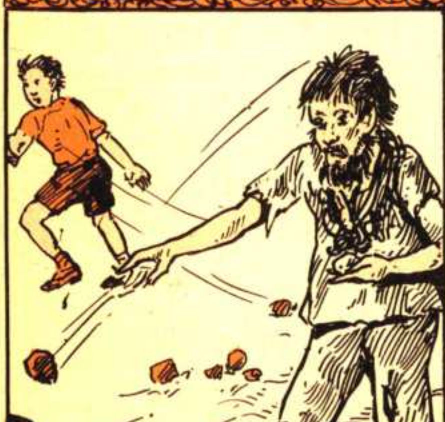
پٹاخے
یا دوسری آتش بازی
سڑک پر چھوڑنے سے کسی
کے چوٹ لگ سکتی ہے
حادثہ
ہوسکتا ہے۔

چاقو، چھری یا
کسی بھی نوکیلی چیز کو
احتیاط سے استعمال نہ کیا
جائے تو ہاتھ زخمی
ہوسکتے ہیں۔





گائے، بیل وغیرہ
کو بلا وجہ مارنے اور بھگانے
سے
راستہ چلتے ہوئے لوگوں کو
چوٹ لگ سکتی ہے۔



پاگل
آدمی کو نہیں چھیڑنا
چاہیے
وہ پتھر وغیرہ مارنے
لگتا ہے۔

SAMI.65



سائیکل
احتیاط سے چلانا چاہیے
اور
اس پر ایک سے زیادہ آدمیوں
کو نہ بیٹھنا چاہیے۔



سیڑھیوں پر سے
تیزی
سے نہ اترو چڑھو،
جلدی میں گرنے کا خطرہ
رہتا ہے۔

SAMI.65



جانور اپنا علاج کرتے ہیں

تحریر: آر جی بالڈرج

ترجمہ: عبداللہ خاور

ایک بار کانٹے دار تاروں کے جنگلے میں ایک چڑیا پھنس گئی اور اس کی پسلی زخمی ہو گئی۔ ایک رحم دل لڑکے نے چڑیا کو پکڑ کر اس کے زخم پر پٹی باندھ دی اور اسے چھوڑ دیا۔ چھوٹتے ہی چڑیا بڑی کوشش سے اڑی اور ایک درخت پر جا بیٹھی۔ وہاں اس نے سب سے پہلے چونچ سے پٹی کھول ڈالی اور پھر زخم کے ارد گرد کے سارے پر نوچ ڈالے۔ تین دن کے بعد چڑیا پھر نظر آئی۔ اس کا زخم بالکل ٹھیک تھا۔ اس نے اپنا عِلاج آفتابی شعاعوں سے کیا تھا۔

ایک گلہری روزانہ توتے کے پنجرے کے گرد روٹی اور پھلوں کے ٹکڑے حاصِل کرنے کے لیے منڈلایا کرتی تھی۔ توتا اس پر غراتا اور بُرا بھلا کہتا تھا اور کاٹنے کے لیے دھمکاتا تھا ایک دن گلہری کی ٹانگ توتے کی چونچ میں آگئی۔ بس پھر اتنی زور سے کاٹا کہ گلہری کی ٹانگ کھال میں جھُولنے لگی۔ وہ ٹرٹراتی ہوئی بھاگی اور درخت پر چڑھ گئی۔ ایک شاخ پر تین چار دن تک چپ چاپ چھپی رہی۔ اس کی ٹانگ بالکل ٹھیک ہو گئی اور ہڈی بھی جڑ گئی۔

پہاڑی چوہے زخمی ہو جاتے ہیں تو اپنے زخم کو جراثیم اور دھول سے بچانے کے لیے اس پر کسی درخت کا گوند لگا لیتے ہیں۔ ریچھ بھی اسی طرح اپنے زخموں کو گوند سے یا صاف مٹی سے چھپا لیتے ہیں اور اسے پانی لگنے سے بچاتے ہیں۔

بندر زخمی ہوتا ہے تو بہتے ہوئے خون کو اپنے ہاتھ سے دبا کر روکتا ہے، پھر اس پر پتیاں چپکاتا ہے۔

اگر کِسی آدمی کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے تو اسے صحیح حالت میں لا کر کھپچیاں (SPLINTERS) باندھتے ہیں، یا سخت پلاسٹر لگا دیتے ہیں۔ میں نے ایک بار دیکھا کہ ایک مرغ کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ وہ اسی کروٹ لیٹ گیا۔ کئی دن تک اسی حالت میں پڑا رہا۔ آخر اس کی ہڈی جڑ گئی۔ اور ہاں، لیٹنے سے پہلے، اس نے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو چونچ سے برابر بھی کیا تھا۔

ہُد ہُد کو ٹوٹی ہوئی ہڈی پر گیلی مٹی یا باریک جڑوں کا پلاسٹر چڑھاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

جب کوئی جنگلی جانور زخمی ہوجاتا ہے تو سکون کی جگہ پر چلا جاتا ہے اور دوا کے طور پر مختلف پودے کھاتا ہے۔ شیر، بھیڑیے جیسے گوشت خور جانور بھی بیماری اور مجروح ہونے کی حالت میں سبزی خور بن جاتے ہیں۔ ریچھ بھی پرہیزی غذا، یعنی بیر اور جڑیں وغیرہ کھانے لگتے ہیں، ہرن درختوں کی چھال پر گزارہ کرتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چوپائے اور پرندے ایسے پودے اور بوٹیوں کا علم رکھتے ہیں، جو خاص خاص بیماریوں میں فائدہ دیتے ہیں۔ پرانے زمانے کے باشندوں نے علمِ طب کی ابتدائی باتیں جانوروں ہی سے سیکھی تھیں، مثلاً سانپ کو مارنے کے بعد نیولا ایک خاص پودے کی پتیاں کھالیتا ہے۔ مرغی بارش کے زمانے میں اپنے بچوں کو نرم گھاس تلاش کر کے کھلاتی ہے۔ بھیڑیے کو جب سانپ کاٹ لیتا ہے تو وہ ناگ پھنی کھاتا ہے۔ جلدی بیماریوں کی حالت میں بندر کو نیم کی کونپلیں توڑ توڑ کر کھاتے دیکھا گیا ہے

جب جنگلی جانور کو بخار آتا ہے تو وہ ایسی جگہ تلاش کرتا ہے، جہاں سایہ ہو، کھلی ہوا ہو اور پانی قریب ہو۔ وہ وہاں پڑا رہتا ہے۔ فاقہ کرتا ہے اور پانی پیتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس جب جانور کے جوڑوں یا عضلات میں تکلیف ہوتی ہے تو وہ ایسی جگہ جاتا ہے، جہاں سورج کی روشنی زیادہ سے زیادہ ملے۔

ریچھ اور دوسرے درندے جب بوڑھے ہونے لگتے ہیں تو گرم چشموں کی تلاش کرتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ غسل کرتے ہیں۔ چڑیاں اور چوپائے بھی غسل کے شوقین ہوتے ہیں۔ جسم سے جوئیں اور پسو بھگانے کے لیے گدھے اور پرندے مٹی میں لوٹتے ہیں، گویا غسلِ آبی کے بجائے غسلِ خاکی کرتے ہیں۔ جانوروں کے غسل کی قسمیں تین

ہیں ، آبی ، خاکی ، آفتابی ، موسمی تبدیلیوں کے ساتھ ، جانور اپنی غذاؤں میں تبدیلی کرتے ہیں اور اپنی جسمانی ضروریات اور موسم کے تقاضوں سے خوب واقف معلوم ہوتے ہیں۔ ہرنیں میلوں ایسے پانی کی تلاش میں جاتی ہیں، جس میں چونے کی مقدار زیادہ ہو۔ انڈے دینے والی چڑیوں کو کیلشیم کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ساحل سمندر پر جاتی ہیں اور گھونگھے چُن چُن کر کھاتی ہیں۔

بیماری کی حالت میں جانور قدرتی علاج کرتے ہیں۔ جڑی بوٹیاں خالص ہوا اور مکمل آرام، قدرتی شفاخانے کی زود اثر دوائیں ہیں۔ جانوروں کا عِلم بھی حیرت انگیز ہے اور اس عِلم پر ان کا اعتماد بھی حیرت انگیز ہے۔

جب کسی زخمی عضو کے درست ہونے کی امید نہیں رہتی تو ڈاکٹر اسے کاٹ دیتے ہیں۔ جانوروں کو بھی اس آخری طریقۂ علاج کا عِلم ہے۔

اگر کسی جانور کا عضو بری طرح جال میں پھنس جاتا ہے تو وہ اسے کاٹ کر آزاد ہو جاتا ہے۔ جانور یہ جانتا ہے کہ آزادی ایک عضو سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ ایک خرگوش کا بچّہ اس طرح جال میں پھنسا کہ اس کا جسم باہر رہا اور ایک ٹانگ پھنس گئی۔ اس کی ماں نے پہلے تو جال کو کاٹنے کی کوشش کی ، لیکن جال فولاد کے تاروں کا تھا، لہٰذا وہ نہ کٹا۔ اب بچے کی ماں نے بچے کی پھنسی ہوئی ٹانگ کاٹنا شروع کی۔ شکاری چھپا ہوا یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔ وہ جلدی سے آیا اور اس نے خرگوش کے بچے کو آزاد کر دیا۔

لطیفہ

بچّہ : (سپاہی سے) تم بہت ڈرپوک معلوم ہوتے ہو۔

سپاہی: وہ کیوں ؟

بچہ : اس لیے کہ تم ڈر کے مارے ہر وقت بندوق اُٹھائے پھرتے ہو۔

شمشیر علی ۔لاہور

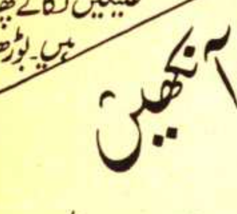
آپ کی آنکھیں

حکیم کوثر چاندپوری

آنکھیں خدا کی بڑی نعمت ہیں، دنیا کی ساری خوب صورتی اور دل چسپی کا اندازہ آنکھوں ہی سے ہوتا ہے۔ علم کی دولت بھی آدمی کو ان ہی کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ پڑھنے کو اندھے بھی پڑھ لیتے ہیں۔ مصر کے ایک بہت بڑے عالم ڈاکٹر طٰہٰ حسین قطعی نابینا ہیں۔ انھوں نے بہت کچھ پڑھا ہے کتابیں بھی لکھی ہیں، مگر وہ بہت زیادہ کام اپنی فرانسیسی بیوی کی مدد سے کرتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ بینائی نہ ہو تو انسان کسی نہ کسی کی مدد کا محتاج ضرور رہتا ہے۔ آنکھوں کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ آپ اسکول میں پڑھتے ہوں یا کالج میں، آنکھوں کا بہت زیادہ خیال رکھیے۔ آپ کا مستقبل روشنی کے ان ہی جھروکوں سے جگمگائے گا۔ آج کل آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ کثرت سے عینکیں لگائے پھرتے ہیں۔ بوڑھوں کو چھوڑیے کہ ان کے اور اعضا کے ساتھ آنکھیں بھی کمزور ہو جاتی ہیں جوانوں اور نوجوانوں، بلکہ نونہالوں کو لیجیے، جو ابھی اسکول ہی میں پڑھتے ہیں اور ان سے پوچھیے کہ بھلا آپ کیوں عینک کا سہارا لیتے ہیں؟ اس کا جواب وہ کچھ ہی دیں ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ ان کی بینائی ان کی اپنی یا ان کے والدین کی غفلت اور بے احتیاطی کی وجہ سے کمزور ہوتی ہے، بینائی کو کیونکر عرصہ تک اچھی حالت میں رکھا جا سکتا ہے؟







آئیے اس کی ترکیبیں سنیے:۔

آنکھوں کی صفائی بہت ضروری ہے ان کی صفائی کا بندوبست اسی وقت ہونا



پڑھنے کا غلط طریقہ



پڑھنے کا صحیح طریقہ

چاہیے جب بچہ پیدا ہو اور اس دنیا میں پہلا سانس لے، اسی وقت اس ننھے اور معصوم کی آنکھوں کے ڈھیلوں اور پپوٹوں کو میل کچیل اور گندگی سے صاف کرنا چاہیے اگر اس وقت صفائی کا بہتر بندوبست نہ کیا گیا تو آگے چل کر بچہ آنکھوں کی نہ جانے کتنی بیماریوں کا شکار ہو جائے گا۔ جو نونہال اسکول یا مدرسے میں پڑھتے ہیں ان کے لیے خوب کھلے، روشن اور ہوادار کمروں کا انتظام ہونا چاہیے۔ ان کی کتابیں بھی اس انداز سے چھپنی چاہییں کہ آنکھوں پر پڑھتے وقت زیادہ زور نہ پڑے، اسکول میں پڑھنے والے بچوں کی آنکھوں کا بار بار معائنہ کیا جانا چاہیے۔ جو لڑکے قریب نظری کی شکایت میں مبتلا ہوں ان کو کسی ماہر چشم سے فوراً مشورہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ آنے والی بیماریوں سے بچ جائیں اور بینائی ٹھیک رہے اور دیکھیے اب تک تو ایسی باتیں بتائی گئی ہیں جن کا تعلق آپ کے والدین یا حکومت اور محکمۂ تعلیم کے افسران سے ہے۔ مگر آنکھوں کی حفاظت کے سلسلے میں آپ پر بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ پڑھنے کی کتابیں یا لکھنے کے کاغذات ہمیشہ آپ کو آنکھوں سے ۱۸۔ انچ دور رکھنے چاہییں۔ اپنی پڑھنے کی میز کو اس طرح جمائیے کہ لالٹین یا بجلی کی روشنی آپ کی میز پر بائیں طرف سے پڑے۔ اگر امتحان کا زمانہ ہے اور آپ کو زیادہ دیر تک پڑھنے یا لکھنے کی ضرورت ہے اور وقت رات کا ہے جب سورج کی قدرتی روشنی موجود نہیں ہے تو آپ کو

لالٹین یا لیمپ اور بجلی کے قمقمے پر کوئی کپڑا، کاغذ یا کوئی اور ایسی چیز لگا لینی چاہیے، تاکہ آنکھیں تیز روشنی اور چکا چوند سے محفوظ رہیں۔ لیمپ وغیرہ کو اس انداز سے رکھیے کہ روشنی کتاب یا کاپی پر بائیں ہاتھ کی طرف سے پڑے اور جناب یہ لیٹ کر پڑھنے کی عادت آپ نے کیوں ڈال رکھی ہے؟ بستر پر لیٹ کر پڑھنے کو آنکھ کے ماہرین بالکل پسند نہیں کرتے۔ وہ اس کی سختی سے ممانعت کرتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی خاص مجبوری ہو اور آپ لیٹ کر پڑھنے پر مجبور ہوں، تو روشنی اور کتاب کے فاصلے کو بالکل ٹھیک رکھیے۔ ریل، موٹر یا چلتی گاڑی میں بیٹھ کر پڑھنا بھی ٹھیک نہیں، اس حالت میں پڑھنے سے آنکھوں کی مختلف بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگر نگاہ بالکل ٹھیک ہو اور روشنی بھی اچھی طرح آ رہی ہو اسی کے ساتھ پڑھنا بہت ضروری ہو تو کوئی حرج نہیں، اگر کسی نونہال کی آنکھیں بچپن ہی میں خراب ہیں تو اس کی پوری ذمہ داری اس کے ماں باپ پر ہے۔ ضرور اس کی پیدائش کے وقت آنکھیں دکھنے آئی ہیں اور اس کے باپ یا ماں کو کوئی خراب قسم کی بیماری رہی ہے، اسی کے ساتھ علاج ٹھیک نہیں کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ اب بچے کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ماں باپ کی یہ پوری ذمہ داری ہے کہ جب پیدائش کے فوراً بعد بچے کی آنکھیں دکھنے آئیں تو علاج پر پوری توجہ کریں۔ بچوں کی آنکھیں بہت نازک ہوتی ہیں۔ تیز روشنی سے بھی انھیں نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے بچوں اور ان کے والدین کو پوری احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ بچوں کو غیر موزوں حالات میں اپنی آنکھوں سے زیادہ کام نہیں لینا چاہیے۔ روشنی ٹھیک رکھنی چاہیے۔ زیادہ باریک چھپائی کی کتاب نہیں پڑھنی چاہیے۔ ایسی کتابیں پڑھنے سے قریب نظری کی شکایت ہو جاتی ہے۔ آنکھوں کو میل کچیل سے صاف رکھنا بہت ضروری ہے۔ خراب ہاتھ یا میلا کپڑا آنکھ کی صفائی کے لیے ہرگز استعمال نہ کیا جائے۔ ایسا کرنے سے بہت سے خراب مادوں کی چھوت لگ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے خراش یا ورم کی شکایت ہو جاتی ہے۔ آنکھوں پر مکھیاں کبھی نہ بیٹھنے دیجیے، یہ طرح طرح کا زہر اپنے سروں پر لگائے پھرتی ہیں اور

اس زہر سے آنکھوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اگر آپ کو بھینگے پن کا شبہ ہو یا آنکھوں سے پانی بہنے لگے اور پپوٹوں میں سوزش کی شکایت محسوس ہو تو اپنے ابا جان سے کہہ کر آنکھ کے کسی ماہر کو بلایئے یا خود اس کے پاس جایئے آپ نے ذرا بھی غفلت کی تو آنکھوں کو نقصان پہنچ جانے کا ڈر ہے۔

اگر چلتے پھرتے یا کھیلتے کودتے آپ کی آنکھ میں مٹی یا کوئی ذرّہ یا ریل کا کوئلہ پڑ جائے تو آنکھ کو ملیے نہیں، بلکہ کسی صاف رومال سے نہایت احتیاط کے ساتھ اسے نکالیے اس حالت میں آنکھ کو ملنا بہت خطرناک ہوگا، "طبقہ قرنیہ" جو آنکھ کا ایک نازک پردہ ہے، چھل جائے گا۔ جب آنکھ سے ذرہ نکل جائے تو اس میں بادام یا ارنڈی کا عمدہ قسم کا تیل لگا دینا چاہیے۔ ہر قسم کی احتیاط کرنے کے بعد بھی بینائی کمزور ہو جائے تو آنکھ کے کسی ماہر سے مل کر چشمہ خرید لینا چاہیے۔ اپنی عینک کے آئینوں کو گرد و غبار سے ہمیشہ صاف رکھیے، چمکیلی چیزوں پر نگاہ نہ جمایئے!



سب سے اونچی لہر

سمندر کے بارے میں ملاحوں کے عجیب و غریب قصے سینکڑوں برس سے مشہور ہیں۔ ان ہی قصوں میں سمندر کی لہروں کی بلندی کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کہی گئی ہیں کہ ان پر کبھی کسی کو یقین نہیں آتا تھا، لیکن اب ایسے بہت سے قصوں کو سچ سمجھا جانے لگا ہے۔ سمندر کی جانچ پڑتال کرنے والے تحقیقاتی اداروں نے معلوم کیا ہے کہ بعض اوقات ایک ہی جگہ مخالف سمتوں سے آنے والی لہریں جب ٹکراتی ہیں تو اس جگہ بہت بلند لہریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اونچی لہر کی اطلاع فروری ۱۹۳۳ء میں ایک جہاز یو ایس۔ ایس راماپو نے دی تھی۔ یہ لہر سطح سمندر سے ۱۲ فیٹ بلند اٹھی تھی۔



حُسن کے دو عظیم شاہکار

راز یوسفی

شاہینہ کے والد جمیل صاحب افریقہ کے علاقے کینیا میں بہت بڑے زمیندار اور درد گردہ کے پرانے مریض تھے۔ جب ان کی تکلیف نے زیادہ شدت اختیار کرلی تو مجبوراً گردے کے اپریشن کے لیے انھیں نیروبی جانا پڑا اور ان کی غیر حاضری میں کھیتوں کی دیکھ بھال کا تمام بوجھ شاہینہ کے کم زور کاندھوں پر آن پڑا۔

شاہینہ کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ اسے پاکستان سے آئے ہوئے ابھی تین ماہ ہی گزرے تھے۔ پاکستان میں وہ اپنی بیمار اور مفلوج ماں کے ساتھ اپنے ماموں کے ہاں رہا کرتی تھی، جو بہت دولت مند تھے۔ ان کے ہاں کسی بات کی کمی نہ تھی، اس لیے اس نے تعلیم بھی خوب حاصل کی تھی اور اس کے ساتھ ہی گھڑ سواری اور بندوق کے ساتھ شکار کھیلنے میں بھی خاصی مہارت پیدا کرلی تھی۔ ماں کے انتقال کے بعد فوراً اسے پاکستان سے اپنے والد صاحب کے پاس کینیا کے علاقے میں آکر رہنا پڑا، جہاں بہت سے کھیت تھے۔ بے شمار ڈھور ڈنگر تھے اور اپنے والد صاحب کے سوا اس کے لیے کوئی اور دل چسپی کا سامان نہ تھا، جس گاؤں میں وہ رہتے تھے، وہ بھی شہر سے بیس میل کی دُوری پر واقع تھا اور اب تو والد صاحب کی اچانک بیماری نے اس کی تنہائی میں اور بھی اضافہ کردیا تھا، تاہم وہ بڑی دلیر لڑکی تھی اور اِسی لیے اس نے تمام ذمے داریوں کو بڑی جرأت کے ساتھ قبول کرلینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

یہ گاؤں سرسبز اور اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان ایک چھوٹی سی وادی پر واقع تھا،

جہاں دور دور تک کچے پکے مکانوں کی قطاریں تھیں۔ یہ وادی سمندر کی طرح تنہا اور وسیع تھی۔ قریب ہی گھنا جنگل تھا، جہاں دن دہاڑے بارہ سنگھوں اور زیبروں کے ریوڑ گھومتے پھرتے تھے۔ شاہینہ کے مویشیوں کی دیکھ بھال کا کام افریقی لڑکے کرتے تھے، جو مویشیوں کو خونخوار درندوں سے سے بچانے کے لیے اپنے ہاتھوں میں تیر کمان لیے پھرتے تھے۔

شاہینہ نے پاکستان کے خوش حال علاقے میں پرورش پائی تھی، اس لیے قدرتی طور پر وہ کھیل تماشے دیکھنے کی عادی تھی، لیکن تیس سیاہ فام حبشیوں اور ہزاروں مویشیوں کی دیکھ بھال کی ذمّے داری نے اسے ان تمام دل چسپیوں سے محروم کر دیا تھا۔

الان مارش ایک سیاہ فام حبشی اس کا نزدیکی ہمسایہ تھا، جو پانچ میل کے فاصلے پر ایک پتھروں کے مکان میں رہتا تھا۔ یہ مکان ڈھلوان پر واقع تھا، اس لیے شاہینہ اسے دور سے بھی آسانی سے دیکھ سکتی تھی اور رات کے وقت اس آبادی کے مکانوں سے چھن کر نکلتی ہوئی روشنی کو دیکھ کر اس کے دل کو بڑی ڈھارس بندھتی تھی۔

الان بڑی اچھی طبیعت کا مالک تھا۔ وہ وقت بے وقت شاہینہ کے کام آتا تھا۔ نیروبی میں اس کے باپ کی بہت بڑی زمینداری تھی، جس کی دیکھ بھال اسی کے ذمے تھی، مگر وہ چوں کہ دیہات میں پیدا ہوا تھا، اِس لیے اس علاقے سے اسے دلی لگاؤ تھا اور وہ عام طور پر اپنے دیہاتی مکان میں ہی رہتا تھا۔

جب اس نے جمیل صاحب کی بیماری کی خبر سنی تو ان کے گھر کا حال معلوم کرنے کے لیے گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا۔ اس نے شاہینہ کو دیکھا، جو جودھپوری طرز کی چست پتلون اور بش شرٹ پہنے گائے بھینسوں کے دودھ دوہنے کے کام کی نگرانی کر رہی تھی۔ وہ حبشیوں کی زبان سے ناواقف تھی، لیکن کام کرنے والے کچھ لڑکے ٹوٹی پھوٹی انگریزی جانتے تھے، جن کی مدد سے وہ تمام ملازموں سے کام لے رہی تھی۔ الان دیر تک شاہینہ کے لہراتے ہوئے گھنگریالے بال اور بڑی بڑی نیلی آنکھیں دیکھتا رہا اور اس احساس سے چونک اٹھا کہ شاہینہ جیسی کم عمر لڑکی میں اتنے بڑے کاروبار کو سنبھالنے کی کتنی زبردست اہلیت موجود تھی۔ اس نے ملازموں کے چودھری بوڑھے سلیم کو بھی دیکھا، جو بڑی وفاداری کے ساتھ ملازموں سے کام لے رہا تھا۔ الان ان تمام باتوں سے بہت متاثر ہوا۔

اس نے رات کا کھانا شاہینہ کے ساتھ کھایا۔ کھانے کا کمرہ خوب سجا ہوا تھا، جس میں بہت سی کتابیں اور تصویریں تھیں۔ ایک گوشے میں میز پر ریڈیو رکھا ہوا تھا، جس سے ساری دنیا کی خبریں سنی جا سکتی تھیں۔

"میں آہستہ آہستہ اس علاقے کو پسند کرنے لگی ہوں۔" شاہینہ بولی "یہ عجیب و غریب ملک ہے

اور یہاں کی آب و ہوا بے حد خوش گوار ہے۔ انسان اس کی رنگینیوں میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ یہ بے حد وسیع، بے حد خاموش اور بے حد شان دار علاقہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ تمام ملازم مجھے پسند کرتے ہیں۔"

"کیا تمھیں یہاں رات کو ڈر نہیں لگتا؟"

الان نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں، بالکل نہیں۔ میرے پاس بندوق ہے اور میں اسے چلانا بھی جانتی ہوں، لیکن کبھی کبھی لگڑ بگڑ مجھے ڈرا دیتے ہیں۔ وہ بھوتوں کی طرح رات بھر ادگرد گھومتے رہتے ہیں۔"

"ان سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔" اس نے اطمینان دلایا، "لیکن شیروں سے بچنے کے لیے دروازہ بند رکھنا چاہیے۔ ان سے تمھیں تو کوئی خاص خطرہ نہیں، لیکن وہ گائے بھینسوں کے جانی دشمن ہیں۔"

شاہینہ یہ سن کر کچھ سہم سی گئی۔ اس نے شیروں کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ الان نے اسے بتایا کہ شیر کبھی کبھی جانوروں پر حملہ کرکے اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور اس طرح کئی مرتبہ وہ اس کے مویشیوں کو بھی ہڑپ کر چکے ہیں۔

کافی رات گئے وہ چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ کبھی وقت ملنے پر آتا جاتا رہے گا۔ اگر کبھی اس کی مدد کی ضرورت ہو تو کسی ملازم کے ہاتھ پیغام پہنچتے ہی وہ فوراً چلا آئے گا۔

اگلی صبح شاہینہ نے ایک بڑی ہولناک خبر سنی۔ بوڑھا چودھری سلیم یہ خبر لایا تھا کہ ٹاکاہل کے مقام پر رات کے وقت شیروں نے ایک بیل کو مار گرایا ہے۔ اس خبر نے ہر طرف ایک سنسنی سی پھیلا دی۔ شاہینہ کے سینے پر سانپ سے لوٹنے لگے۔ اس نے رات بھر کوئی چیخ و پکار یا شور نہیں سُنا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بے حس چٹان کی طرح سوتی رہی اور اس کا مال تباہ ہوتا رہا۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ خود موقع پر پہنچ کر تمام حالات معلوم کرے گی۔

چناں چہ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے بندوق شانے پر لٹکائی اور گھوڑے پر سوار ہوکر ٹاکاہل کی طرف روانہ ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے خود کو اس سو فیٹ بلند پہاڑی پر پایا، جو اتنی بلندی پر بھی میدان کی طرح ہموار اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں اور پتھریلی چٹانوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ یہاں جمیل صاحب کا بہت بڑا کھلیان تھا جس میں کاٹی ہوئی فصل حفاظت کے لیے رکھی جاتی تھی اور اس کے اردگرد بہت سی خاردار جھاڑیاں تھیں اور کانٹوں والی تاریں۔

فصل اور مویشیوں کی دیکھ بھال کے لیے وہاں تین جھونپڑیاں تھیں، جن میں گڈریے اپنے کنبوں کے ساتھ رہتے تھے۔ بوڑھے سلیم نے شاہینہ کا استقبال کیا اور گول چکر کی شکل میں پھیلی ہوئی بارہ فیٹ چوڑی باڑھ میں وہ جگہ دکھائی، جسے توڑ پھوڑ کر شیر اندر داخل ہوا تھا اور بیل کو مار کر اس کا ڈھانچہ باہر گھسیٹ کر لے گیا تھا۔ اس عرصے میں شیرنی باڑھ کے باہر کھڑی نگرانی کرتی

رہی اور جب ملازم شور کرتے ہوئے اپنی جھونپڑیوں سے باہر آئے تو اس نے دل ہلا دینے والی غراہٹ کے ساتھ انھیں سہما دیا تھا۔

پھر بوڑھا سلیم کئی پیچ دار راستوں سے گزرتا ہوا شاہینہ کو اس مقام پر لے گیا، جہاں ایک موسہ درخت کے نیچے مُردہ بیل کا ڈھانچہ پڑا ہوا تھا اور جس کا نچلا حصّہ شیروں کی غذا بن چکا تھا۔ بوڑھے سلیم نے بڑے ادب سے کہا،

"باقی حصّہ کھانے کے لیے شیروں کا جوڑا آج رات کو پھر آئے گا اور انھیں بندوق کا نشانہ بنانے کے لیے وہ موقع بہت مناسب ہوگا۔"

شاہینہ اپنی گھوڑے کی کاٹھی پر بیٹھی ہوئی سارے معاملے پر غور کرتی رہی کہ اگر جلدی ہی شیروں کا کوئی انتظام نہ کیا گیا تو وہ ایک ایک کر کے تمام مولشیوں کو ہڑپ کرلیں گے اور اس سے نہ صرف اسے مالی نقصان ہوگا، بلکہ اس کے والد صاحب بھی یہ سمجھیں گے کہ اس نے کاروبار کی دیکھ بھال میں غفلت برتی۔ چناں چہ اس نے فوراً بوڑھے سلیم کو حکم دیا کہ اسی مقام پر ایک جھونپڑی تیار کی جائے، جو ہر طرح سے محفوظ ہو۔ اس کے اندر بیٹھ کر وہ شیروں کو اپنی بندوق کا نشانہ بنائے گی۔

واپسی پر دن کافی چڑھ آیا تھا اور کلیمن جارو پہاڑ کی بلند چوٹیوں پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ وہ گہری سوچ کی ندی میں ڈوبی ہوئی تھی اور ابھی سے آنے والی رات کا خوف اس کے ذہن کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ الان اس موقع پر ضرور اس کے کام آئے گا، لیکن اگر کسی وجہ سے وہ اس موقع پر اس کی کوئی مدد نہ کر سکا، تب بھی وہ ہر قیمت پر اپنا فرض ادا کرے گی۔ شیر کا مقابلہ دشوار ہی سہی، لیکن محض دشواری کو بہانہ بنا کر پیچھے ہٹ جانا بھی تو کوئی بہادری نہیں۔

گھر پہنچ کر اس نے الان کے نام ایک چٹھی لکھی اور ملازم کو ہدایت کی کہ وہ چٹھی الان کو دے آئے۔ پھر اس نے چائے پی اور شیروں کے شکار کے بارے میں جتنی کتابیں اسے اپنے والد کی لائبریری سے ہاتھ لگیں، بیٹھ کر پڑھنے لگی۔ اس نے وہ تمام حصّے بڑے غور سے پڑھے، جن کا تعلق ان انتظامات سے تھا، جو شکاری شیر کا شکار کھیلنے سے پہلے کرتے ہیں اور پھر ان کے کیا نتیجے نکلتے ہیں؟ جتنی دیر تک وہ پڑھتی رہی، اسی قدر اس میں خود اعتمادی بڑھتی رہی۔ اور آخر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ جب چھُپ کر شیر کو بندوق کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو وہ بدلہ لینے کے بجائے جلدی سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ بجلی کی مشعل کی تیز روشنی اسے بوکھلا دیتی ہے اور وہ پریشان ہو کر روشنی کی لکیر پر اپنی نگاہیں گاڑ دیتا ہے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے شیر کا شکار اتنی معمولی سی بات ہے، جیسے شاخ پر بیٹھے ہوئے کسی کم زور سے پرندے کو گولی کا نشانہ بنا دیا جائے۔

سہ پہر کے وقت اس کا ملازم یہ خبر لایا کہ الان گھر پر نہیں ملا۔ وہ کسی دوسرے ہمسائے کی امداد کے لیے دس میل دور کے فاصلے پر گیا ہوا

تھا، اسی وقت بوڑھے سلیم نے آکر یہ اطلاع دی کہ شیروں کو گولی کا نشانہ بنانے کے لیے چھُپ کر بیٹھنے کی جگہ تیار ہو چکی ہے۔ شاہینہ بڑی مشکل میں تھی۔ اس نے بھول کر بھی یہ نہ سوچا تھا کہ اسے یہ تمام کام سرانجام دینا پڑے گا، لیکن اب وہ اپنا ارادہ تبدیل کر کے بوڑھے سلیم کی نگاہوں میں بزدل بننا بھی نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کی عزت کا سوال تھا۔ اگر اس موقع پر بزدلی دکھائے گی تو ملازموں پر اس کا کوئی اثر و رعب نہیں رہے گا اور وہ اسے ایک کم زور سی لڑکی سمجھ کر نظر انداز کر دیں گے۔ چناں چہ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب اس کام کا انجام چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو، وہ پیچھے نہیں ہٹے گی۔

جب شام کے سائے گہرے ہو گئے اور ہر طرف اندھیرے کے بھوت ناچنے لگے تو شاہینہ بوڑھے سلیم کو ہمراہ لے کر ٹاکا پہاڑ کے دامن میں جا پہنچی، جہاں بہت سے افریقی حبشیوں کا گروہ اسے "خدا حافظ" کہنے کے لیے موجود تھا۔ کئی ملازم کمبل، گرم کافی کی بوتل اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں لیے کھڑے تھے۔ شاہینہ کے پاس روشنی کی مشعل اور اس کے والد کی دو نالی بندوق تھی، جو اس کے کاندھے سے لٹکی ہوئی تھی۔

یہاں سے جلوس کی شکل میں چلتے ہوئے سب چھپ کر بیٹھنے والی جگہ کے پاس پہنچ گئے، جو کانٹے دار شاخوں سے بنائی گئی تھی اور لمبائی چوڑائی میں شاہینہ کے قد کاٹھ سے بڑی نہ تھی۔ وہ گھٹنوں کے بَل گھسٹ کر پیچھے کی طرف بنے ہوئے سوراخ کے راستے سے اندر داخل ہو گئی۔ ملازموں نے ایک ایک کر کے تمام سامانِ ضرورت اندر پہنچا دیا، پھر سوراخ کا منھ کانٹوں والی جھاڑیوں سے بڑی مضبوطی کے ساتھ بند کر دیا گیا۔ اندر داخل ہو کر شاہینہ نے تمام کمبل زمین پر بچھا دیے۔ چھپنے والی جگہ میں سامنے کی طرف ایک چوڑے منھ کا سوراخ تھا، جس کے ٹھیک سامنے پانچ قدم کے فاصلے پر مُردہ بَیل کا ڈھانچہ پڑا تھا۔ ملازموں نے اسے آخری بار "الوداع" کہا اور بہت ہی نیک دعائیں دے کر واپس چلے گئے۔ اب وہ بالکل اکیلی رہ گئی تھی۔

رات کی تاریکی برابر بڑھ رہی تھی اور ماحول پر گہرے سناٹے کی چادر تن گئی تھی جنگلی جانوروں کی چہل پہل شروع ہو گئی، جس سے شاہینہ کے دل میں خوف کا شدید احساس کروٹیں لینے لگا۔ اس نے جلدی ہی یہ محسوس کر لیا کہ اس کی چھپنے والی جگہ کچھ زیادہ مضبوط نہیں تھی۔ خاص طور پر شیر کے لیے تو یہ بات بہت ہی آسان تھی کہ وہ ایک ہی چھلانگ میں اس کے اندر داخل ہو کر اس کی تکا بوٹی کر دے۔ اس دہشت ناک تصوّر سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور جسم کٹی ہوئی شاخ کی طرح تھر تھر کانپنے لگا، مگر جلد ہی اس نے اپنے دل پر قابو پا لیا اور آرام کرنے کے لیے بستر پر لیٹ گئی، مگر یہاں آرام کا خیال ہی بے کار تھا۔ کمبل کے نیچے پڑی ہوئی نوکیلی شاخیں

اور پتھر اس کے جسم میں کچوکے سے دے رہے تھے، مگر اس نے کسی تکلیف کی پروا نہ کی اور سانس روکے ہوئے آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگی۔

اب ہر طرف گہرے اندھیرے کا راج تھا۔ چاند ابھی تک نگاہوں سے اوجھل تھا۔ گہری تاریکی میں ستارے ننھے ننھے چراغوں کی طرح چمک رہے تھے، جن کی روشنی میں سامنے پڑا ہوا بیل کا ڈھانچہ صاف نظر آرہا تھا، جس سے دماغ کو سڑا دینے والی بدبو اٹھ رہی تھی، مگر ہوا کی تیزی اس کے اثر کو کچھ کم کررہی تھی۔

اپنا کام شروع کرنے کے ارادے سے اس نے دو نالی بندوق کو بھر کر سوراخ میں جما دیا۔ کافی کا ایک پیالہ پیا اور چند بسکٹ کھانے کے بعد سوراخ سے باہر دیکھنے لگی۔

آہستہ آہستہ درختوں کی پھننگیوں کے پیچھے سے پیلے رنگ کا چاند اٹھا، جس کی پیلی روشنی سے آس پاس کی چیزیں جگمگا اٹھیں اور ہر چیز صاف نظر آنے لگی۔ اس خوب صورت منظر سے شاہینہ کے دل کی کچھ ڈھارس بندھی۔

اچانک جھاڑیوں میں ایک ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی اور ایک زور دار سانس کی آواز سے خاموشی کا جادو ٹوٹ گیا۔ شاہینہ کے دماغ کی رگیں جھنجھنا اٹھیں۔ اس نے کسی دقت کے بغیر یہ معلوم کرلیا کہ وہ شیر تھا۔ ماحول کا سکون درہم برہم ہوگیا۔ ہر طرف بے چینی کروٹیں لینے لگی۔ اس نے یوں محسوس کیا، جیسے کسی بڑے دیو نے چاند کے چمک دار چہرے کو اپنے پروں میں چھپا لیا ہو۔ اس نے مضبوطی سے اپنے دانتوں کو دبا لیا اور خوف زدہ نگاہیں سوراخ سے باہر کے منظر پر جما دیں۔

پتوں سے ہلکی ہلکی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہورہی تھی، جو شاہینہ کے دل کو ایک دہشت ناک شور سے زیادہ اونچی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے زندگی میں اتنا بڑا شیر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے لمبے تڑنگے جسم اور بھاری بھرکم سر کے سامنے وہ خود کو ایک چھوٹی سی چوہیا کے برابر سمجھ رہی تھی۔ وہ کتنا خوب صورت دکھائی دے رہا تھا اور ایسے شاہانہ انداز سے کھڑا تھا، جیسے اس علاقے کا خود مختار بادشاہ ہو۔ ایک لمحہ کے لیے اس کے دل سے خوف کا احساس جاتا رہا اور شیر کے شاہانہ جاہ و جلال میں کھو گئی۔

تھوڑی دیر بعد جھاڑیوں کے پیچھے سے شیرنی نمودار ہوئی، جس کا جسم بے حد خوب صورت تھا اور قد میں شیر سے چھوٹی تھی۔ وہ ادھر اُدھر دیکھے بغیر بیل کے ڈھانچے کے پاس پہنچی اور گوشت پر ٹوٹ پڑی۔ تھوڑی دیر بعد شیر بھی اس ناشتے میں شامل ہوگیا۔

شاہینہ ایک بت کی طرح گم سم بیٹھی رہی۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ فوراً روشنی کی تیز شعاعیں شیر پر پھینک کر بندوق کی لبلبی دبا دیتی، مگر اس نے کتاب میں پڑھا تھا کہ اگر شیر کو مار دیا جائے تو شیرنی کا انتقام بڑا خوف ناک ہوتا ہے، اس لیے اس نے سوچا کہ پہلے وہ شیرنی کو مارے گی، لیکن وہ ایسا بھی نہ کرسکی اور بڑے سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ

کیا کہ جب وہ دونوں پیٹ بھر کر سو جائیں گے، تب وہ اپنا کام کرے گی۔

درخت کے نیچے روشنی کم تھی، اس لیے شیرنی ڈھانچے کو گھسیٹ کر چھپنے والی جگہ کے اور پاس لے آئی۔ اب شاہینہ اور شیرنی کے درمیان کوئی فاصلہ نہ رہا تھا۔ شیر سیدھا بیٹھا ہوا گھریلو بلی کی طرح ایک ہڈی کو چچوڑ رہا تھا اور شیرنی کی نگاہیں شیر پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد شیر اٹھ کر جوں ہی شیرنی کے قریب آیا تو شیرنی نے اپنا سر پیچھے کی طرف موڑا۔ اس کی بڑی سی کھردری زبان باہر نکل آئی اور شیر اپنے گال اس کی زبان سے رگڑنے لگا۔ شاہینہ یہ دیکھ کر بھونچکا سی رہ گئی۔ اس نے تو کبھی بھول کر بھی یہ نہ سوچا تھا کہ ایسے خوں خوار درندوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت اور پیار کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔

شیر دوبارہ لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں اور اس پر یوں غنودگی طاری ہوگئی، جیسے لذیذ کھانا کھانے کے بعد انسانوں پر نشہ چھا جاتا ہے اور وہ آرام کرنا چاہتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد شیرنی بھی میٹھی نیند کے مزے لینے لگی۔

شاہینہ کو اس تمام صورتِ حال پر ایک خواب کا سا گمان ہو رہا تھا۔ وہ دو خوں خوار شیروں کے قریب بیٹھی تھی، جو اسے اس وقت پالتو بلیوں کی طرح بے ضرر نظر آ رہے تھے، لیکن وہ ابھی تک اپنے مقصد کو نہیں بھولی تھی۔ اسے ایک اہم فرض ادا کرنا تھا۔ اگرچہ اس کے دل سے خوف دور ہو چکا تھا، لیکن پھر بھی وہ کچھ بے چین سی دکھائی دے رہی تھی۔

جب اس نے بندوق اٹھا کر اپنے کاندھے پر جمائی تو اچانک اس کی کہنی سے بجلی کی مشعل دب گئی اور روشنی کی ایک پتلی سی لکیر اچھل کر باہر جا پڑی اور شیر کے گرد ایک سنہرا گول چکر بن گیا۔ شیر چپ سادھے پڑا رہا۔ اس نے شاید یہ سمجھا ہو کہ روشنی کی یہ لکیر چمکتے ہوئے چاند کی چاندنی ہوگی۔ شاہینہ کے لیے گولی چلانے کا اس سے بہتر اور کوئی موقع نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے مضبوطی سے لبلبی دبائی، لیکن جذباتی کش مکش کے باعث اس کا کاندھا ہل گیا۔ بندوق سے ایک شعلہ سا نکل کر تڑپا اور گولی ہوا کا سینہ چیرتی ہوئی آسمان کی بلندیوں میں گم ہوگئی۔ خاموشی کا جادو ٹوٹ گیا اور کچھ دیر کے لیے اس نے یہ محسوس کیا، جیسے پوری کمین گاہ اس پر آ گری ہو اور وہ اس کے بوجھ تلے دب گئی ہو۔ فضا میں ایک خوف ناک "وُف" کی آواز گونجی اور دوسرے لمحے شیروں کا جوڑا جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔

اس نے جان بوجھ کر اپنا نشانہ خطا کر دیا تھا اور وہ اس پر خوش تھی۔ ایسے خوب صورت اور دل کش جانور کو جان سے مار دینا اس کے نزدیک کسی انسان کو قتل کر دینے سے کم نہیں تھا۔ اگرچہ اس نے بیل کھا کر اسے نقصان پہنچایا تھا، مگر یہ بہت معمولی بات تھی۔ بیل اور بھی

مل سکتے ہیں، مگر شیر جنگل کا بادشاہ ہے، بے خوف اور دلیر۔ اس کا وجود پریوں کی کہانی سے زیادہ حسین ہے۔

انھی خیالات میں کھوئی ہوئی وہ گہری نیند سو گئی۔ صبح سویرے اس کے ملازم اسے اس قید سے رہا کرانے کے لیے حاضر ہو گئے۔ بوڑھا سلیم شیروں کے مرجانے کی خوش خبری سننے کے لیے بے چین تھا، کیوں وہ رات کو ہی گولی چلنے کی آواز سن چکا تھا۔

"شیر آئے تھے، مگر میرا نشانہ چوک گیا۔" شاہینہ تھکی ہوئی آواز میں بولی۔ "لیکن مجھے یقین ہے اب وہ کبھی نہیں آئیں گے۔ میں نے انھیں ڈرا دیا ہے۔"

بوڑھے سلیم نے یہ سن کر منھ لٹکا دیا۔ اسے اس ناکامی کا بڑا افسوس تھا۔

گھر پہنچ کر ابھی اس نے ناشتہ ہی کیا تھا کہ الان آپہنچا۔ اس کا رنگ زرد تھا اور چہرے سے گھبراہٹ ظاہر تھی۔

"یہ سراسر دیوانگی تھی۔" وہ آتے ہی چیخ اٹھا، "میں حیران ہوں کہ تم نے ایسی غلطی کیسے کی۔ کبھی کسی نے شیر کا شکار اس طرح نہیں کھیلا۔ یہ تمھاری خوش قسمتی ہے کہ شیر آئے ہی نہیں۔"

"شیر آئے تھے۔" وہ بڑے اطمینان سے بولی۔ "ایک شیر اور ایک شیرنی — حسن کے دو عظیم شاہ کار — وہ مجھ سے صرف پانچ قدموں کے فاصلے پر تھے الان، لیکن میں نے انھیں جان بوجھ کر نہیں مارا اور مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے۔"

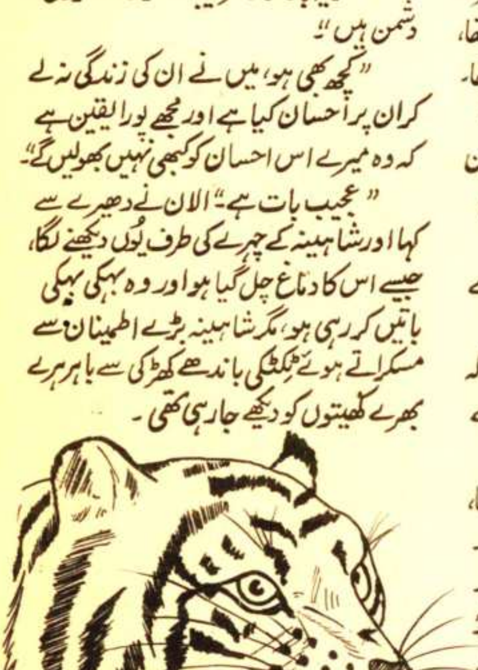
"کیوں؟" وہ حیرت کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔

"کیوں کہ شیر جنگل کا بادشاہ ہے اور بادشاہوں کو مارنا بہت بڑا گناہ ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر یہ بادشاہ غریب ڈھور ڈھنگروں کے دشمن ہیں۔"

"کچھ بھی ہو، میں نے ان کی زندگی نہ لے کر ان پر احسان کیا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ میرے اس احسان کو کبھی نہیں بھولیں گے۔"

"عجیب بات ہے۔" الان نے دھیرے سے کہا اور شاہینہ کے چہرے کی طرف یوں دیکھنے لگا، جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو اور وہ بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو، مگر شاہینہ بڑے اطمینان سے مسکراتے ہوئے ٹکٹکی باندھے کھڑکی سے باہر ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھے جا رہی تھی۔




صحت اور عدم صحت
خون ہی کی دو مختلف حالتوں کا نام ہے
عمدہ اور صالح خون
فاسد خون
خراب خون صحت اور حیات انسانی کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے۔ فساد خون سے خارش، کھجلی، پھوڑے، پھنسیاں، مہاسے، گرمی دانے، چنبل، ناسور، چھیپ، نکسیر جیسی بیماریاں لاحق ہوتی رہتی ہیں۔
خون میں فاسد مادے ہر وقت سرایت کرتے رہتے ہیں۔ ان کو بے اثر بنانے کے لئے صافی کا باقاعدہ استعمال کیجئے۔ صافی خون کی صفائی اور تقویت کا بہترین ذریعہ ہے۔
فساد خون کی ایک بہترین دوا ہے۔
جلدی بیماریوں سے بچاتی ہے۔
بہترین ملین اور قبض کشا ہے۔
جگر کی اصلاح کرکے ہاضمہ کو ٹھیک کرتی ہے۔
عام تندرستی کو بہتر بناتی ہے۔
ہمدرد
SAFI
صافی
خون صاف کرنے کی قدرتی دوا



حوصلوں اور کارناموں کی کہانی ...

جب ننھے ننھے بچے دادا یا دادی کو گھیر کر ضد کرتے ہیں کہ ہمیں کوئی کہانی سنائیے تو بزرگوں کو ایک زرّین موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ اس وقت وہ جھوٹے اور بے معنی قصّوں کے بجائے انھیں نہایت شفقت سے ایسی کہانیاں سناتے ہیں جن میں ہمارے درخشاں ماضی کی پُرلطف تصویر ہوتی ہے۔ وہ ایسے قصے سناتے ہیں جن میں نیکی و شرافت اور عزم واستقلال کا سبق ہوتا ہے۔ اور ایسی داستانیں بیان کرتے ہیں جو معصوم دلوں کو انسانی ہمدردی، بلند حوصلگی اور بڑے بڑے کارنامے انجام دینے پر اُبھارتی ہیں۔

ہمدرد کی کہانی بھی عزم واستقلال کی کہانی ہے۔ اس کے بانیوں اور منتظمین نے انسانی ہمدردی کے جذبے سے متاثر ہو کر اپنے لیے ایک راہ متعین کی مشکلات کا بلند حوصلگی سے مقابلہ کیا اور مخلوق خدا کی خدمت کا جو بیڑا اٹھایا تھا اسے پورا کرنے میں ان کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔ ادارہ ہمدرد کے دواخانے اور ان کا شعبہ نشر واشاعت لوگوں کو بیماریوں سے نجات دلانے کے لئے بساط بھر کوشاں ہے۔ ان کی لیبورٹریز میں ماہرین طب قدیم تجربات اور جدید معلومات کی روشنی میں نئی موثر اور کم قیمت دوائیں بنانے کے لیے برابر مصروف رہتے ہیں۔ طب یونانی کا درخشاں ماضی ان کا مرجع و ماخذ ہے اور سائنس کی روز افزوں ترقی ان کی رہبر۔

ہمدرد نے اپنے آپ کو نوعِ انسانی کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ تاکہ امراض کے علاج کے لئے بہتر سہولتیں میسر آسکیں

ہمدرد یونانی طب کے علم بردار اور دواساز



مغربی افریقہ کی ایک لوک کہانی

بکرے نے ہاتھی کو بھگا دیا!

بہت دنوں کی بات ہے کہ ایک دِن ایک ہاتھی اور ایک بکرے میں بحث چھڑ گئی۔ بات در اصل یہ ہوئی کہ ہاتھی نے بکرے سے کہہ دیا کہ میں تم سے زیادہ کھا سکتا ہوں۔ اس پر بکرا بولا کہ واہ، میں تم سے بھی زیادہ کھا سکتا ہوں جھگڑا بڑھتا ہی گیا۔ ہاتھی بولا، "میاں بکرے، ذرا میرے جسم کو تو دیکھو۔ تمھارے ایسے دس بھی میرے برابر نہیں، لہٰذا ظاہر ہے کہ میں تم سے دس گنا زیادہ کھا سکتا ہوں۔"

اس پر بکرا بولا، "ہاں۔ یہ سچ ہے کہ جسم کے اعتبار سے تم مجھ سے بہت بڑے ہو، لیکن پھر بھی جتنا میں کھا سکتا ہوں، اتنا تم ہرگز نہیں کھا سکتے۔ میں تو بس کھاتا ہی چلا جاؤں گا۔"

یہ سُن کر ہاتھی بڑا ناراض ہوا اور بڑے زور سے چِلّایا، "یہ بات ہے تو پھر آجاؤ۔ آج ہی مقابلہ ہو جائے۔" بکرے نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا اور بولا، "بالکل ٹھیک ہے۔ بس ابھی سے شروع ہو جاؤ، دیکھیں تو بھلا کون زیادہ کھاتا ہے، مگر ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ ہم دونوں میں سے جو بھی جیت جائے گا، وہ پھر بعد میں دوسرے کو کھا جائے گا۔"

ہاتھی نے کہا، "اچھا، مجھے یہ شرط بھی منظور ہے۔"

بکرا بولا، "تو پھر تیار ہو نا؟"

ہاتھی چلّایا، "ہاں، ہاں، بالکل تیار ہوں" اور یہ کہتے ہی ہاتھی نے بڑے زور سے اپنی سونڈ گھما کر ایک بڑا سا گھاس کا گٹھّا اُکھاڑ لیا اور اسے اپنے مُنھ میں ٹھونس لیا۔ ادھر بکرے نے بھی گھاس کھانا شروع کر دی۔ ہاتھی نے پہلے گٹھّے کو اپنے حلق کے نیچے اتارا ہی تھا کہ فوراً دوسرے گٹھے پر سونڈ ماردی اور اسے اُکھاڑ کر کھانے لگا۔ اس کے بعد اس نے درختوں کی پتیوں کو اپنی سونڈ سے گھسیٹنا شروع کر دیا اور انھیں بھی کھا گیا، پھر آگے بڑھ کر اور جو گھاس دکھائی دی اُسے کھانا شروع کر دیا۔ ہاتھی کی تیزی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے منھ سے تو چباتا جارہا تھا اور سونڈ سے اور گھاس پھوس اکھاڑتا جارہا تھا۔

ادھر بکرا یہ کر رہا تھا کہ وہ بالکل ذرا سی گھاس اپنے منھ میں لے لیتا تھا اور بڑی دیر تک اسی کو آہستہ آہستہ چباتا رہتا تھا۔ کبھی چند پتیوں کو مُنھ میں رکھ لیتا تھا اور انھیں بھی خوب دیر تک آہستہ آہستہ چباتا رہتا تھا۔ قصّہ مختصر یہ کہ بکرا جو چیز بھی اپنے منھ میں رکھتا تھا، اسے نہایت آہستہ آہستہ چباتا جاتا تھا اور خوب دیر تک اپنا مُنھ چلاتا رہتا تھا۔ اس وقت بکرے کو اگر کوئی دیکھتا تو وہ یہی سمجھتا کہ بکرا کسی گہرے خیال میں غرق ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں آس پاس کی تمام گھاس پھوس اور پتیاں بالکل صاف ہو گئیں، کیونکہ ہاتھی اور بکرے نے انھیں صفا چٹ کر دیا۔ چنانچہ ہاتھی مزید گھاس اور پتیوں کی تلاش میں اور آگے بڑھا۔ ادھر بکرا بھی دوسری سمت کھسک گیا، مگر وہ زیادہ دور نہیں گیا۔ ہاتھی سارا دن اسی تیزی سے کھاتا رہا۔ اس نے جنگل کی تمام گھاس کھا ڈالی۔ یہی حال اس نے درختوں کی پتیوں کا بھی کیا۔ اس کے بعد اس نے درختوں کی شاخیں اور جڑیں کھانا شروع کر دیں آخر کار ہاتھی اتنا زیادہ کھا گیا کہ اس کے لیے چلنا بھی دوبھر ہو گیا۔ اس لیے اب مزید کھانے کا کوئی سوال ہی نہ رہا۔ اس کے علاوہ اب رات بھی ہونے والی تھی، چناں چہ وہ بکرے کی تلاش میں چل پڑا۔

اس وقت ہاتھی بڑے فخر سے یہ سوچ رہا تھا کہ میں نے تو اتنا زیادہ کھا لیا ہے کہ جنگل کے سارے درخت لنڈ ورے ہو گئے ہیں اور دُور دُور تک کہیں گھاس بھی نہیں دکھائی دیتی۔ ہاتھی کو اب یہ بالکل یقین ہو گیا تھا کہ اس نے بکرے سے کہیں زیادہ کھا لیا ہے۔ اب وہ بکرے کی تلاش میں تھا کہ وہ مل جائے اور اسے وہ یہ بتا دے، مگر بکرا کہیں دکھائی ہی نہیں دیا۔ آخر کار چلتے چلتے ایک جگہ پر ہاتھی کو بالکل اچانک بکرا دکھائی دے گیا۔

بکرا ایک پہاڑی پر بیٹھا ہوا تھا اور مسلسل کچھ چباتے جا رہا تھا۔ ہاتھی نے بڑی حیرت سے چاروں طرف دیکھا، مگر اسے گھاس پھوس کچھ بھی نظر نہ آیا۔ پتیاں بھی کہیں دکھائی نہ دیں۔ اب تو ہاتھی بڑا چکرایا۔ چناں چہ اس نے بکرے سے پوچھا، "کیا تم ابھی تک کھا رہے ہو؟"

بکرے نے بڑے اطمینان سے جواب دیا، "اور نہیں تو کیا۔ کیا تم سمجھے تھے کہ میں نے کھانا ختم کر دیا ہے۔ میں تو تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں تم سے بھی زیادہ دیر تک کھا سکتا ہوں اور میری خوراک بھی تم سے کہیں زیادہ ہے۔"

یہ سن کر ہاتھی بڑا سِٹ پٹایا۔ گھبرا کر بولا، "مگر آخر تم کھا کیا رہے ہو؟ یہاں تو نہ گھاس پھوس ہے اور نہ پتیاں؟"

بکرا بڑے فخر سے بولا، "میں اب یہ پتھر کھا رہا ہوں اور جوں ہی میں نے اس پتھر کو ختم کیا تو پھر میں تم کو بھی کھا جاؤں گا۔"

یہ سن کر ہاتھی بے حد خوف زدہ ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ جب یہ پتھر کو کھا سکتا ہے تو پھر اسے مجھ کو کھاتے کیا دیر لگے گی۔ مانا کہ میری کھال موٹی ہے، مگر جو جانور پتھر کو چبا سکتا ہے، وہ میری کھال بھی چبا ڈالے گا۔ چناں چہ یہ خیال آتے ہی ہاتھی فوراً وہاں سے چنگھاڑتا ہوا بھاگا، مگر اب بھاگنا بھی اس کے لیے بڑا دشوار ہو رہا تھا، کیوں کہ اس کا پیٹ اتنا بھر چکا تھا کہ اسے چلنا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ بہر حال جس طرح بھی بنا ہاتھی وہاں سے لڑ دو گیارہ ہو گیا اور جتنی تیزی سے ہو سکا بھاگا۔

بس اس دن سے لے کر آج تک ہاتھی ہمیشہ بکرے سے ڈرتا ہے۔

الزہرا، ایک محل

جس میں چار سو کمرے تھے

★ خلیفہ عبدالرحمٰن نے قرطبہ کے قریب "الزہرا" نامی ایک محل بنوایا جو پچیس برس میں تیار ہوا اور جس پر ۴۵ کروڑ دینار خرچ ہوئے۔ اس محل میں چار سو کمرے تھے۔ اس کے دروازے آبنوس کے تھے، جن پر سونے، چاندی اور ہاتھی دانت کا نہایت خوب صورت کام کیا گیا تھا۔ ایک بڑے کمرے میں پتھر کے حوض میں صرف پارا بھر دیا گیا تھا، جس سے آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔ اگر پارے کو ذرا ہلایا جاتا تو معلوم ہوتا کہ محل میں سخت طوفان آگیا ہے۔ یہ محل سنگِ مرمر کے ایک وسیع چبوترے پر کھڑا کیا گیا تھا۔ "الزہرا" کی عظمت دیکھ کر اس کے وزیر المنصور نے بھی ایک محل "الزاہرہ" بنوایا۔

عشرت رحمانی



ماں کی خوشنودی

ماں باپ کو اپنی اولاد سے جو محبت اور پیار ہوتا ہے، وہ تو تم میں سے ہر نونہال کو اچھی طرح معلوم ہے۔ خاص کر ماں اپنی اولاد کے لیے کتنے دکھ جھیلتی ہے۔ اس کو پالنے پوسنے میں نہ دن کے آرام کا خیال ہوتا ہے نہ رات کی تکلیف کا۔ ہر بچہ اپنے ماں باپ سے بھی اسی طرح پیار کرتا اور ان کا ادب اپنا فرض سمجھتا ہے۔ مسلمانوں میں ماں باپ بلکہ سب بڑوں کا ادب سب سے زیادہ کیا جاتا ہے۔ ہمارے دین اسلام میں ماں کا رتبہ اتنا بڑا ہے کہ "ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے"۔

ہم تمھیں ایک ایسے مسلمان بزرگ کی کہانی سناتے ہیں، جنھوں نے اپنے بچپن میں ماں کے حکم کے لیے اتنا عجیب و غریب کام کر کے دکھایا کہ ان کی ماں بھی حیران رہ گئیں اور یہ حکم بھی ایک بڑی معمولی سی بات کے لیے تھا، مگر اتفاق سے وہ بات بہت بڑی اور غیر معمولی بن گئی۔

حضرت بایزید بسطامی بچے ہی تھے کہ ایک روز رات کو اپنا سبق یاد کرتے کرتے تھک گئے اور کتابیں رکھ کر سونے کے لیے چارپائی پر لیٹ گئے۔ ان کی بزرگ ماں برابر چارپائی پر سو رہی تھیں۔ ان کی آنکھ جو کھلی تو پیاس معلوم ہوئی۔

انھوں نے بیٹے کو آواز دی۔ " بایزید، ذرا مجھے پانی پلا دے "۔ بیٹے نے جلدی سے اٹھ کر پاس رکھا ہوا پانی کا برتن دیکھا اور پانی انڈیلنے لگے، مگر معلوم ہوا کہ برتن میں پانی نہیں ہے۔ وہ وہاں سے گھر میں کسی دوسری جگہ پانی کے اور برتن تلاش کرنے لگے کہ جلدی سے ماں کو پانی پلا دیں۔ اتفاق کی بات کہ گھر بھر کے سارے برتن خالی تھے۔ پانی کا ایک قطرہ بھی کہیں نہ ملا۔

بایزید گھبرا کر اپنے ہمسایہ کے گھر گئے اور وہاں سے پانی لا کر ماں کی پیاس بجھانے کا ارادہ کیا۔ ہمسائے کے گھر کا دروازہ بند تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اندر سب لوگ بے خبر سو رہے ہیں۔ کسی کی آواز سنائی نہ دی۔ بایزید نے خیال کیا کہ اتنی رات گئے اگر دروازے پر دستک دی تو سوتے ہوئے ہمسائے جاگنے سے پریشان ہوں گے۔ انھیں کیوں تکلیف دوں۔ برابر کے دوسرے ہمسائے کے گھر سے پانی مانگ لیتا ہوں۔ دوسرے گھر میں بھی سب لوگ سوئے پڑے تھے۔ اب یہ بہت پریشان ہوئے۔ انھیں بار بار اس بات کا خیال آتا تھا کہ ماں سوتے سے جاگی ہیں۔ انھیں پیاس لگی ہوگی اور میں اتنی دیر سے ان کے حکم کی تعمیل نہیں کر سکا۔ اتنی ذرا سی خدمت بھی میں اپنی ماں کی نہیں کر سکتا۔ بڑے شرم اور افسوس کی بات ہے، مگر یہ اتفاق تھا۔ اس میں ان کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔

اب انھوں نے سوچا کہ یہ اور بھی شرم کی بات ہے کہ میں واپس گھر لوٹ جاؤں اور اپنی بزرگ ماں سے کہوں کہ پانی نہیں ملتا۔ انھیں پیاس کی تکلیف ہوگی۔ آخر وہ جلدی جلدی گھر میں آئے اور پانی کی صراحی لے کر تالاب کی طرف روانہ ہوگئے کہ وہاں سے پانی بھر کر لائیں۔ اس وقت آدھی رات گزر چکی تھی اور رات بھی اندھیری تھی۔

بایزید ماں کی پیاس کا خیال کر کے دوڑتے ہوئے تالاب کی طرف جا رہے تھے کہ جتنی جلدی ہو سکے پانی لے آئیں۔ کمسن بچہ اور جنگل بیابان، ہو کا میدان۔ چاروں طرف جنگلی جانور چیخ رہے تھے، مگر ماں کے ادب اور پیار نے ان کے دل سے ہر طرح کا خوف دور کر دیا تھا۔ بس فکر تھی تو اتنی کہ جیسے ہو سکے وہ جلدی سے پانی لے آئیں۔ دوڑتے ہوئے اندھیرے میں ایک پتھر سے ٹھوکر لگی۔ سارا منھ اور سر زخمی ہوگیا، مگر انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ صراحی ہاتھ سے چھوٹ کر الگ جا گری اور وہ ٹوٹنے سے بچ گئی اور پھر جلدی سے بھاگنے لگے، مصیبت یہ ہوئی کہ اندھیرے میں راستہ بھول گئے، جو تالاب مکان سے قریب تھا اس سے بھٹک کر کہیں دور پہنچ گئے۔ اس لیے اور بھی دیر لگی۔ زخموں سے خون بہہ رہا تھا اور وہ دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ تھک کے چور ہوگئے، مگر ایک تالاب کے کنارے پہنچ کر ہی دم لیا۔

پیاس سے ان کا حلق بھی خشک ہو گیا تھا۔

زخموں کی تکلیف اور پھر اتنی دور بھاگتے ہوئے گئے۔ تالاب کے کنارے پہنچ کر ان کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اب اس خیال سے خود پانی بھی نہ پیا کہ میری پیاری ماں اتنی دیر سے پیاسی ہیں اور میں خود پانی پینے بیٹھ جاؤں۔ جلدی جلدی صراحی بھری اور کندھے پر رکھ کر پھر دوڑے اندر پہنچے اور پیالہ میں پانی لے کر ماں کے سرہانے آئے۔ دیکھا تو ماں سو رہی تھیں۔ سوچا نیند سے جگاؤں تو ماں کو تکلیف ہوگی۔ پیالہ ہاتھ میں لیے چپ چاپ سرہانے کھڑے رہے کہ جب ماں کی آنکھ کھلے تو پانی پلا دوں۔ اس دوڑ بھاگ اور انتظار میں کھڑے کھڑے صبح ہونے لگی۔ فجر کی اذان ہوئی۔ اب ان کی ماں کی آنکھ کھلی اور جلدی سے کلمہ پڑھتی ہوئی اٹھ بیٹھیں کہ نماز کے لیے وضو کروں۔ دیکھا تو بیٹا سرہانے کھڑا ہے۔

دراصل جب ان کی ماں سوتے سوتے پہلی بار جاگی تھیں اور پانی مانگا تھا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ان کی آنکھ پھر لگ گئی تھی اور کروٹ لے کر بے خبر سو گئی تھیں۔ اب جو اٹھیں تو انھیں یاد بھی نہ رہا کہ بیٹے سے پانی مانگا تھا۔ انھوں نے پوچھا، "بیٹا خیر ہے۔ کیوں کھڑے ہو؟" بایزید نے پانی کا پیالہ ان کے سامنے بڑھاتے ہوئے عرض کی کہ "آپ نے پانی مانگا تھا۔ پانی پی لیجیے۔" اس پر بزرگ ماں کو رات اپنا پانی مانگنا اور پھر سو جانا یاد آیا اور دعائیں دیتے ہوئے پیالہ ہاتھ میں لیا کر پانی پیتیں، مگر بیٹے کی طرف دیکھ کر گھبرا گئیں کہ سارا سر اور منہ لہولہان ہے۔ بیتاب ہو کر پوچھا، "یہ کیا ہوا میرے لال؟"

بایزید نے سارا ماجرا ماں کو سنا ڈالا۔ ماں نے بیٹے کی یہ فرماں برداری اور پیار دیکھ کر بایزید کو گلے لگا لیا اور جلدی سے ان کے زخموں کو دھو کر پٹی باندھی۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے ایسا پیارا اور اطاعت گزار بیٹا عطا کیا ہے اور اللہ پاک سے دعا کی کہ

"باری تعالیٰ! جیسے آج میرے بایزید نے مجھے خوش کیا ہے، تو بھی اسی طرح اسے اپنی خوشنودی سے نواز اور اپنی برکتیں اور رحمتیں اس پر نازل فرما۔"

خداوند کریم نے بزرگ ماں کی دعا قبول کی اور اپنی برکتوں سے نیک دل، اطاعت شعار بایزید کو ایسا نوازا کہ ان کا نام دنیا میں ادب اور احترام سے لیا جاتا ہے اور اسلامی تاریخ میں ان کا نام حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ مشہور ہے۔ بڑے بڑے بزرگ ان کے نام کی تعظیم کرتے ہیں۔

دنیا میں سب سے بڑی مچھلی "وہیل مچھلی" ہوتی ہے۔ اس کی لمبائی چار سو فیٹ تک اور وزن تین ہزار من تک ہوتا ہے۔ جب وہیل مچھلی کے انڈے سے بچہ نکلتا ہے تو وہ قریباً بیس فیٹ لمبا ہوتا ہے۔

(ظہور الدین گل)



حبیب کیفوی

شیخ اور اس کا گھوڑا

عرب قبیلے کے ایک شیخ کے پاس اعلا نسل کا ایک گھوڑا تھا، جو اتنا خوب صورت اور سجیلا تھا کہ سارے عرب میں اس کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ شیخ اس گھوڑے کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ اسے گھوڑے کا مالک ہونے پر بھی بڑا فخر تھا اور وہ اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھتا تھا کہ اس کے پاس ایک ایسا گھوڑا ہے، جس کا کہیں جواب نہیں۔ دوسرے سرداروں کی بڑی خواہش تھی کہ اس نسل کا گھوڑا ان کے پاس بھی ہوتا اور وہ بھی فخر سے اپنا سر اونچا رکھتے۔ شیخ کو ہمسایہ سرداروں کی اس خواہش کا علم تھا اور وہ گھوڑے کی بڑی حفاظت کرتا تھا۔ محل کے اندر ہی گھوڑے کا اصطبل تھا اور یہ ایسی محفوظ جگہ تھی جہاں کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ کئی نوکر چاکر گھوڑے کی خدمت کے لیے موجود تھے، جو اس کی دیکھ بھال کرتے۔

یوں تو شیخ کے اصطبل میں اور بھی کئی گھوڑے تھے، لیکن وضع قطع، رنگ ڈھنگ اور سج دھج میں یہ گھوڑا آپ اپنی مثال تھا۔ شیخ اسے عام استعمال میں نہیں لاتا تھا، بلکہ تہوار پر یا کسی خاص سفر کے موقع پر یا جب شاہی جلوس نکلتا تو شیخ اس پر سواری کرتا اور پھر جس راستے سے شاہی سواری گزرتی

لوگوں کی نظریں گھوڑے پر جم جاتیں۔ ہمسایہ علاقے کے سرداروں نے اس گھوڑے کے بدلے میں سینکڑوں گھوڑے پیش کیے، منھ مانگی قیمت دینا چاہی، منت سماجت کی کہ کسی طرح گھوڑا انھیں حاصل ہو جائے، لیکن کسی سردار کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور شیخ نے کسی قیمت پر بھی اس گھوڑے کو جدا کرنا پسند نہ کیا، جس کی وجہ سے سارے عرب میں اس کی عزت اور شہرت تھی۔ اس طرح وہ برسوں اس گھوڑے کا مالک بنا رہا اور تمام علاقے میں فخر سے اپنا سر اونچا رکھا۔

ایک دن شیخ کو کسی خاص کام کے لیے دوسرے علاقے میں جانا تھا۔ اس نے اپنے خاص گھوڑے پر ساز کسوایا اور چند ایک سواروں کو ساتھ لے کر سفر پر روانہ ہو گیا یہ چھوٹا سا قافلہ ایک صحرا سے گزر رہا تھا۔ شیخ کا گھوڑا بڑا تیز رفتار تھا، اس لیے آگے نکل گیا اور باقی سوار پیچھے رہ گئے۔ چلتے چلتے شیخ ایک مقام سے گزر رہا تھا کہ اس کے کانوں میں کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ اس آواز کی طرف بڑھا تو کیا دیکھا کہ ایک انسان خون میں لت پت پڑا ہے۔ کپڑے پھٹے ہوئے ہیں اور قریب ہی کچھ سامان بکھرا پڑا ہے۔ زخموں سے چور اور کراہتے ہوئے انسان کو دیکھ کر شیخ کا دل پسیج گیا اور وہ گھوڑے سے اتر کر مظلوم کے پاس چلا گیا۔ قریب جا کر اس کا شانہ ہلایا اور پوچھا کہ بھائی! کیا بات ہوئی اور یہ تمھاری کیا حالت بنی ہے؟ زخمی عرب نے درد سے کراہتے ہوئے اور رُک رُک کر کہا کہ اے نیک دل انسان! کیا بتاؤں کہ مجھ پر کیسا ظلم ہوا ہے۔ آہ! میں اپنے گدھے پر سوار اس صحرا میں سفر کر رہا تھا اور اپنے گھر جا رہا تھا کہ اچانک ڈاکوؤں نے مجھے گھیر لیا اور سب کے سب مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ مجھے بری طرح زخمی کر دیا اور میرا سامان لوٹ کر چلے گئے ہیں۔ شیخ نے یہ دردناک کہانی سن کر بڑا افسوس کیا اور زخمی عرب کو دلاسا دیا۔ پھر اپنے مشکیزے سے اسے پانی پلایا۔ زخمی نے پانی پی کر شیخ کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگر آپ اس وقت میری مدد کو نہ پہنچتے تو میں پیاس کے مارے اس صحرا میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر چکا ہوتا۔

شیخ نے جواب دیا کہ یہ میرا انسانی فرض تھا کہ ایک مظلوم کی مدد کرتا۔ اب تم کوئی فکر نہ کرو، مجھے بھی وہیں جانا ہے، جہاں تم جا رہے ہو۔ میں تمھیں اپنے گھوڑے پر سوار کیے دیتا ہوں اور جب میرے ساتھی پہنچ جائیں

گے تو تمھیں کسی دوسرے گھوڑے پر سوار کرکے تمھارے گھر پہنچا دوں گا۔ زخمی ہمدردی کی یہ باتیں سن کر شیخ کو دعائیں دینے لگا۔ شیخ نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور گھوڑے پر سوار کر دیا اور خود پیدل چلنے لگا۔ اس طرح وہ کچھ دور چلتے رہے، لیکن جوں ہی سوار اور شیخ کے درمیان چند قدموں کا فاصلہ ہوگیا تو زخمی سوار نے گھوڑے کو ایڑھ لگائی اور گھوڑا ہوا ہوگیا۔ شیخ حیران ہو کر دیکھتا ہی رہ گیا کہ مکار زخمی نے اس کی ہمدردی کا یہ کیسا انوکھا بدلہ دیا ہے۔ شیخ ابھی اس سوچ ہی میں تھا کہ وہ کچھ فاصلے پر رک کر پلٹا، خون سے لت پت نقاب اٹھایا اور چلا کر کہا :

"اے شیخ، جانتے ہو میں کون ہوں ؟ مجھے پہچانو! میں اسی قبیلے کا سردار ہوں جس کی منت سماجت کے باوجود تم نے یہ گھوڑا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ دیکھا آخر میں نے گھوڑا حاصل کر ہی لیا۔" پھر ایک قہقہہ لگا کر کہا کہ اے شیخ، جب مجھے پتہ چلا کہ تم اسی گھوڑے پر سفر پر جا رہے ہو تو میں بھیس بدل کر اور زخمی بن کر تمھارے راستے میں پڑا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ تم مجھے اس حالت میں دیکھ کر ضرور رک جاؤ گے اور مجھ پر ترس کھاؤ گے اور پھر میں کسی نہ کسی حیلے تم سے گھوڑا اڑا لوں گا۔ وہ یہ کہہ کر پلٹنے ہی کو تھا کہ شیخ نے اس سے کہا کہ ذرا ٹھہرو اور میری ایک بات سنتے جاؤ۔ سوار جب شیخ کی بات سننے کے لیے ٹھہر گیا، تو شیخ نے بلند آواز سے کہا :

"دیکھو، گھوڑا تو تم لے جا رہے ہو، لیکن یہ بات کسی عرب سے نہ کہنا کہ گھوڑا تم نے مظلوم بن کر حاصل کیا ہے، ورنہ یاد رکھو کہ سارے عرب میں آئندہ کے لیے مظلوموں کا اعتبار اٹھ جائے گا اور کوئی شخص بھی کسی مظلوم کی مدد نہیں کرے گا۔ جاؤ، اب خوشی سے گھوڑا لے جاؤ۔"

شیخ کی اس بات نے سوار پر بڑا اثر کیا اور وہ گھوڑے کو آگے بڑھانے کے بجائے شیخ کے پاس پلٹ آیا اور نہ صرف گھوڑا شیخ کے حوالے کر دیا، بلکہ اپنی غلطی کی معافی مانگتے ہوئے کہا :-

"میں اس قیمت پر گھوڑا نہیں لینا چاہتا جس سے آئندہ سے عرب کے مظلوم انسانوں کا اعتبار اٹھ جائے اور وہ دوسروں کی ہمدردی اور مدد سے محروم رہ جائیں۔"

استاد : بتاؤ آسمان کہاں سے شروع ہوتا ہے؟

ایک شاگرد : جناب الف سے



کچھ کہو کچھ سنو

انجم توحید صدیقی ۔ لاڑکانہ

س : ٹکٹ جمع کرنے کے کیا فائدے ہیں؟

ج : ٹکٹ جمع کرنے کے بہت سے فائدے ہیں، جس میں سے چند یہ ہیں: ٹکٹ جمع کرنے والے کو دنیا کے تمام ملکوں کے نام، جغرافیائی محل وقوع، معاشری و صنعتی حالات یاد ہو جاتے ہیں۔ مشہور ہستیوں کا تعارف اور خاص خاص واقعات کا علم ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کے ذخیرے میں کوئی نادر ٹکٹ ہے تو اس سے مالی فائدہ بھی ہو جاتا ہے۔

شہناز ۔ سلہٹ

س : اسلامی دنیا کی سب سے پرانی یونی ورسٹی کون سی ہے؟

ج : مصر کی جامعہ ازہر غالباً اسلامی ممالک کی سب سے پرانی یونی ورسٹی ہے۔

محمد اقبال عارف ۔ ڈیرہ غازیخاں

س : ہمدرد نونہال ہمیں دیر سے کیوں ملتا ہے؟

ج : تمھیں کب ملتا ہے؟ اور تم کب چاہتے ہو؟

سعید عزیز بلوچ ۔ سرگودھا

س : کیا علم حاصل کرنے کے لیے دولت ضروری ہے ؟

ج : علم حاصل کرنے میں دولت سے مدد تو ملتی ہے، لیکن اگر شوق ہو تو دولت کی کمی بھی پوری ہوسکتی ہے۔

امتیاز حسین ملک ۔ کوئٹہ

س : کہانیاں بھیجنے کی فیس ؟

ج : کہانیاں بھیجنے کی فیس یہی ہے کہ کہانیاں اچھی ہوں۔

اویس احمد ۔ ڈھاکہ

س : آئن اسٹائن کون تھا ؟

ج : آئن اسٹائن دنیا کا بہت بڑا سائنس داں تھا، ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۵۵ء میں انتقال ہوا۔

خورشید احمد وارثی ۔ سکھر

س : تعلیم حاصل کرنے کا مقصد ؟

ج : تعلیم کا مقصد اپنے کو پہچاننا اور اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ہے۔

سیّد ایوب علی ۔ کراچی

س : ہمدرد نونہال کے کل کتنے خریدار ہیں ؟

ج : نونہال کے خریداروں کی تعداد تمھارے اندازے سے زیادہ ہی ہوگی۔

حفیظ الرحمٰن سعیدی ۔ پیلی بھیت

س : اگر میں کوئی کہانی یا مضمون بھیجوں تو آپ شائع کردیں گے ؟

ج : ہم ضرور شائع کردیں گے، مگر کیا تم اچھی سی کہانی بھیجو گے ؟

خالد پرویز ۔ کراچی

س : چین، روس، برطانیہ، امریکا، طاقت کے اعتبار سے نمبر دیجیے۔

ج : چین کو اپنی طاقت اور بڑھا لینے دو، پھر بتائیں گے !

راحت عثمانی ۔ دہلی

س : کہتے ہیں علم جہالت کی تاریکی کو دور کرتا ہے، وہ کس طرح ؟

ج : جہالت اندھیرے کا دوسرا نام ہے۔ علم کی روشنی سے اندھیرا دور ہوجاتا ہے۔

حامد کمال ۔ کراچی

س : توتا درست ہے یا طوطا ؟

ج : توتا ہی درست ہے، جیسا کہ ہم لکھتے ہیں۔



نونہال ادیب

عبدل

زین العابدین
کراچی



کسی زمانے میں مصر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا اس کے یہاں کوئی اولاد نہ تھی، اس واسطے کسان اور اس کی بیوی بہت مغموم رہتے تھے۔ ایک دن خدا نے ان دونوں کی قسمت کا ستارہ چمکا دیا اور ان کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا، جو بہت خوب صورت تھا۔ اس کا نام کسان نے دیہاتی نام عبدل رکھا۔ جب وہ تقریباً آٹھ سال کا ہوگیا تو کسان اسے اپنے ساتھ کھیت لے جانے لگا۔ اتفاقاً وہاں ایک دن پری سیر کرنے آئی اور اتنے خوب صورت لڑکے کو دیکھ کر پری زاد نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ میرے اڑن کھٹولے پر اس کو بٹھا دو۔ وہاں تو حکم دینا تھا کہ

تعمیل ہوگئی۔ جب وہ کوہ قاف پہنچ گئے اور وہاں جاکر پری زاد ملکہ نے اس سے باتیں کرنا چاہیں، مگر ناکام رہی۔ پھر اس کے سامنے ہیرے جواہرات اور سونے وغیرہ کے ہار رکھے، مگر اس نے ان کی طرف دیکھا اور منھ پھیر لیا۔ اس کے سامنے شاہی کھانے رکھے، مگر اس کے منھ میں پانی نہ آیا، بلکہ سویاں جب اس کے سامنے رکھیں تو کہنے لگا کوئی لکڑی بھی کھائی جاتی ہے۔ پھر جب اس کے سامنے چٹنی اور جوار کی روٹی رکھی گئی اور اس کے لیے چٹائی کا دسترخوان بچھایا گیا اور ایک گلاس میں دودھ ایک گلاس میں لسّی اور ایک مٹی کی پیالی میں مکھن لایا گیا تو سب کچھ چٹ کر گیا اور کہنے لگا کہ لاؤ میری بکری، ہیں تھن میں سے دودھ پیوں گا۔ اس کے سامنے بکری لائی گئی اور اس نے بڑے شوق سے تھن کو پکڑا اور کافی دیر تک پیتا رہا۔ جب پی چکا تو کہنے لگا کہ کہاں ہیں کھیت اور کہاں ہے بکریوں کا ریوڑ کہ میں

ان کو چرا کر لاؤں۔ انھوں نے اس کے لیے جنگل بنوا دیا اور بکریاں لائی گئیں۔ وہ بکریوں کو جنگل میں لے گیا اور بارہ بجے کے وقت انھیں لے آیا اور ان کا دودھ خود نے پیا اور کہا کہ پیالہ لاؤ۔ پریوں کو تو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ جو یہ کہے تم وہی کرنا، اسی وقت ایک سونے کا پیالہ لایا گیا اور اس میں اس نے بکری کا دودھ ڈالا اور بادشاہ کے دربار میں آکر کہا کہ یہ دودھ آپ پی لیجیے۔ اس نے بڑے تپاک سے دودھ کا پیالہ لیا اور ایک ہی گھونٹ میں سارا پی گیا۔

پری زاد رانی نے کہا کہ مجھے دودھ نہیں دیا، ہمیں بھی پلاؤ۔ تب عبدل بھاگا ہوا گیا اور دودھ نکال کر پری زاد ملکہ کو پلا دیا۔ پری نے پوچھا کہ تمھارا نام کیا ہے اس نے کہا میرا نام عبدل ہے۔ تب بادشاہ اور ملکہ دونوں ایک دم بول اٹھے کہ آج سے تمھارا نام آفتاب ہے۔ اس نے کہا بہت

اچھا حضور، آپ کا جو حکم۔ یہ نام بادشاہ و ملکہ نے اس واسطے رکھا تھا کہ ان کی بیٹی کا نام ماہتاب تھا اور وہ یہ چاہتے تھے کہ ہم ان دونوں کی شادی کروا کر بادشاہی ان کو سپرد کر دیں۔ اس واسطے کچھ دن بعد آفتاب اور ماہتاب کی شادی کرا دی گئی اور وہ اچھی طرح رہنے سہنے لگے۔ اب ان کے ماں باپ کی سرگذشت پڑھیے۔ جس دن وہاں سے آفتاب لایا گیا تھا اس دن جمعہ تھا اور ان گاؤں والوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جو بچہ اس دن کھوئے گا وہ کسی دوسری جگہ کا بادشاہ بنے گا۔ چناں چہ کئی بچے اس دن کھوئے اور ان کے خیال کے مطابق وہ کہیں کے بادشاہ بن گئے۔ اس واسطے آفتاب کے کھو جانے کا ان کو رنج نہ ہوا، بلکہ ان کو خوشی ہوئی کہ ہمارا بیٹا کہیں کا بادشاہ بن گیا ہوگا۔ قدرت کا معجزہ دیکھیے کہ ان کے یہاں اسی جیسا ایک اور لڑکا پیدا ہوا اس کا نام اس کے بڑے بھائی کے نام پر رکھا گیا اور وہ لوگ اور بھی زیادہ بڑے بھائی عبدل کی طرف سے بے خبر ہو گئے اور ہنسی خوشی دن گزارنے لگے۔

سوات

منیر احمد
جھنگ



سوات جو مناظر قدرت کی وجہ سے خوب صورت اور تاریخی ریاست ہے، مغربی پاکستان کے شمال مغربی حصے میں واقع ہے۔

سیاحوں کی دل چسپی کا یہ مرکز ۴۰۰۰ مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ۶۰۰۰۰۰ افراد پر مشتمل ہے۔ یہاں پر بارش ۳۲ انچ سے ۳۵ انچ تک ہوتی ہے۔ برف بھی ۸ سے ۱۲ فٹ تک پڑتی ہے۔

سیدو شریف اس ریاست کا دارالحکومت ہے۔ جو راولپنڈی سے ۱۵۹ اور پشاور سے ۱۰۹ میل،

درگئی سے ۴۲ میل کے فاصلے پر ہے۔
یہاں پر سیاحوں کے لیے تین مشہور ہوٹل ہیں مثلاً سوات ہوٹل پنس ہوٹل، مدین ہوٹل۔ یہ سیاحوں کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ سوات کی یہ وادی وادیٔ سندھ اور ریاست دیر کے درمیان کھڑی ہے۔

سوات کی سرسبز زمین اور زرخیز وادی، اونچے اونچے برف سے لدے ہوئے پہاڑ۔ اس کے بل کھاتے ہوئے دریا، جن میں لہریں غصّے سے بھی آگے کی طرف چھٹ رہی ہوتی ہیں اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی جھیلیں، اس کے پھلوں سے بھرے باغات اور اس کے پھولوں سے بھرے پارک فطرت کی طرف سے انعام ہے۔

سوات قبل از مسیح سے تاریخی مرکز رہا ہے۔ یہ سکندر اعظم کے زمانے میں یورپ اور ہندستان کی تہذیب کا سنگم رہا ہے۔ یہاں یونانیوں کی حکومت رہی، پھر ہنزہ قبائل نے حکومت قائم کی، جسے بعد میں محمود غزنوی نے فتح کر لیا۔

سوات بدھوں کا مرکز رہا ہے۔
یہاں پر چودہ ہزار خانقاہیں تھیں۔ یہاں سے تبتی اور چینی باشندوں نے تعلیم حاصل کی۔

چینی سیاحوں نے چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں اس علاقے کی سیاحت کی۔ انھوں نے یہاں پر ایک بہت بڑی تہذیب دیکھی۔ بدھ مذہب کا مرکز دیکھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "منگوار"، اُس زمانے کا مشہور شہر تھا۔

اب سیدو شریف، منگورا، مرغ زار، کابل، مدین، کولائی، بحرین، کالام اِس علاقے کے مشہور شہر ہیں۔ یہاں شیر، کالا ریچھ، گراصل اور پہاڑی بکرے وغیرہ کا اچھا شکار ملتا ہے۔

اِس میں فطرتی نظاروں کے علاوہ انسانوں کی پیدا کردہ قابل دید چیزیں ہیں۔ پرانے راجوں کا بسایا ہوا "آدیانہ باغ"، موجود ہے۔ سکندر نے شمالی پاکستان کی طرف بڑھنے کے لیے پہلی جنگ

لڑی۔ یہاں "ٹکنی کرسیوں کی وادی" ہے۔
یہ وہ علاقہ ہے، جہاں کسی زمانہ میں چودہ ہزار بدھ خانقاہیں تھیں۔ یہ وہ تاریخی جگہ ہے، جہاں محمود غزنوی، بابر، اکبر نے ہندوستان کو فتح کرتے ہوئے ابتدائی بڑی جنگیں لڑیں۔
یہاں ضدی اور آزادی پسند قبائل رہتے ہیں۔ جنھوں نے انگریز سلطنت کی حاکمیت ماننے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے خود مختار ریاست قائم رکھی۔ یہ وہی سوات ہے، جو آج پاکستان کا حصہ ہونے پر فخر کرتا ہے۔

لومڑی کی چالاکی

آصف عمران
لاہور



کسی جنگل میں ایک شیر حکومت کرتا تھا، جو بہت طاقت ور تھا، لیکن ایک دن اچانک بیمار پڑ گیا آہستہ آہستہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ وہ چل پھر بھی نہیں سکتا تھا۔ ہر روز جنگل کے تمام جانور اپنے بادشاہ کا حال معلوم کرنے آتے۔
ایک دن بھیڑیے نے کہا، حضور، سب جانور آپ کا مزاج دریافت کرنے آتے ہیں، لیکن لومڑی نہیں آتی۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ لومڑی بڑی مکار ہوتی ہے اور اپنی مکاری اور ہوشیاری سے سب جانوروں کو دھوکا دے جاتی ہے۔ بھیڑیے کے لیے یہ بہت اچھا موقع تھا کہ وہ لومڑی کی چغلی کھاتے اور اسے سزا دلوائے۔ اسی لیے اس نے شیر سے کہہ دیا، حضور، دیکھیے لومڑی کتنی مکار ہے کہ آپ کا مزاج تک دریافت کرنے نہیں آئی اور دوسرے جانوروں سے کہتی پھرتی ہے کہ اچھا ہوا آپ بیمار ہو گئے ہیں۔ شیر یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا اور

حکم دیا کہ اس کو تلاش کر کے لاؤ۔ بیمار تو وہ پہلے ہی سے تھا۔ اس لیے کچھ نہ کہہ سکا۔ یہ تمام بات کسی نے لومڑی تک پہنچا دی۔ اب لومڑی بڑی پریشان تھی۔ اب کیا ہوگا۔ اس بھیڑیے کو میں ضرور سزا دوں گی۔ دوسرے دن وہ خود ہی اپنے چہرے پر تھکاوٹ کے نشان پیدا کر کے شیر کے پاس گئی اور کہا۔ حضور جب مجھے آپ کے بیمار ہونے کی خبر ملی تو میں رہ نہ سکی اور سوچا کہ کسی حکیم کے پاس جا کر علاج معلوم کیا جائے۔ اس لیے میں نے دنیا کے تمام حکیم چھان مارے ہیں، سب نے ایک ہی علاج بتایا ہے کہ وہ بھیڑیے کی ٹانگ کھائیں۔ شیر نے یہ سنتے ہی پاس بیٹھے ہوئے بھیڑیے پر حملہ کر دیا اور ایک ٹانگ کھا گیا اور لومڑی کو شاباش دی کہ اس نے بہت اچھا علاج بتایا ہے۔ لومڑی بھی پاس ہی تھی۔ اس نے بھیڑیے سے کہا، جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے پہلے وہ خود اس میں گرتا ہے۔

خوفناک آواز

جمیل ہاشمی
کراچی



یہ اُن دنوں کی بات ہے جب کہ ہم نے اپنا مکان تبدیل کیا تھا۔ ہمارا نیا مکان ایک سنیما گھر کے بالکل قریب تھا۔ چوں کہ ہم لوگ اس مکان میں نئے نئے آئے تھے اس لیے مجھے ارد گرد کی چیزوں کا کوئی علم نہیں تھا۔ یہ قصہ بھی میری نا علمی کے باعث رونما ہوا، جس کے سبب مجھے سخت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔

ہوا یوں کہ رات کا وقت تھا اور میں اپنے کمرے میں جو دوسرے کمروں سے بالکل الگ تھا، بیٹھا گھر کا کام کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ رات کافی بیت چکی ہے۔ میں نے سامنے میز کے اوپر رکھی ہوئی گھڑی پر نگاہ دوڑائی تو مجھے معلوم ہوا کہ اس وقت پونے بارہ کے قریب ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ صبح اٹھنے میں دشواری ہوگی اس لیے جلدی سے سب کاپیاں کتابیں بند کیں اور بتی بجھا کر بستر پر لیٹ گیا۔

ابھی مجھے پوری طرح نیند نہ آئی تھی کہ ایک دم بندوق کے چلنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی ایک دل خراش چیخ سنائی دی، میں سمجھا کہ کسی نے کسی کو قتل کر دیا ہے! اور یہ خیال آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ابھی میں اس معاملے کو پوری طرح سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ باہر سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باہر کافی مجمع لگ گیا ہے۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا تو واقعی باہر بہت سے لوگ اِدھر اُدھر جا رہے تھے۔ اب مجھے اس بات کا پکا یقین ہو گیا کہ کسی کو قتل کر دیا گیا ہے اور یہ لوگ قاتل کی تلاش میں اپنے گھروں سے نکل پڑے ہیں۔

رات کے اندھیرے میں میں نے گھڑی دیکھی، جس کی چمکتی ہوئی سوئیوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ رات کے بارہ بج چکے ہیں۔ اسی اثنا میں مجھے غنودگی آنے لگی اور تھوڑی ہی دیر میں میں سو گیا۔

صبح کے وقت میں اٹھتے ہی اپنے والد کے پاس پہنچا اور نہایت ہی سہمے ہوئے انداز میں ان کو رات کا سارا واقعہ کہہ سنایا۔ جب میرے والد نے یہ قصہ سنا تو ایک دم ہنس پڑے، پھر بولے کہ " وہ بندوق کے چلنے کی آواز اور دل خراش چیخ سینما گھر میں لگی ہوئی نہایت ہی ڈراؤنی

پکچر کا سین تھا اور وہ مجمع تماشائیوں کا تھا، جو بارہ بجے ختم ہونے والے آخری شو سے فارغ ہوکر اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ اتنا کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگے اور آن کی آن میں یہ بات پورے گھر میں پھیل گئی۔

اب اس بات کا آپ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد مجھے کتنی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

چار دوست

سعید احمد کرمی
ٹھٹھہ



ایک جنگل تھا اس میں بے شمار قسم کے جانور تھے، لیکن انھیں جانوروں میں ایک کوے، کچھوے، چوہے اور ہرن میں بہت دوستی ہوگئی تھی، کوا درخت پر رہتا۔ اس کے نیچے ہی بل میں چوہا رہتا۔ پاس ہی ایک ندی تھی، اسمیں کچھوا رہتا تھا اور ہرن ادھر ادھر چوکڑیاں بھرتا۔ روزانہ دوپہر کو چاروں دوست درخت کے نیچے آبیٹھتے اور خوب باتیں کرتے۔ ان کی دوستی اتنی پکی تھی کہ وہ ہر وقت ایک دوسرے پر جان قربان کرنے کو تیار رہتے
ایک دن کیا ہوا کہ چاروں دوستوں نے خطرے کی بو سونگھی، پتہ چلا جنگل میں شکاری آئے ہوتے ہیں۔ ابھی یہ لوگ سوچ ہی رہے تھے کہ دیکھا شکاریوں نے ہرن کو جال میں پھانس لیا ہے۔ اب تو باقی دوست بہت گھبرائے۔ کچھوا پانی سے نکل آیا۔ چوہے نے بھی بل سے سر نکالا اور کوا کائیں کائیں کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں سب اکھٹے ہوگئے اور سوچنے لگے کہ کس طرح اپنے دوست ہرن کو بچایا جائے
آخر ایک ترکیب دماغ میں آئی کہ چوہا جاکر اس کا جال کترے۔ ادھر چوہا جال کترنے لگا اور کچھوا گھاس

پر ٹہلنے لگا۔ کوا ابھی اِدھر اُدھر کائیں کائیں کرتا رہا۔ تھوڑی دیر میں شکاری اس طرف آنکلے اُدھر چوہا بھی اپنا کام کرچکا تھا۔ جوں ہی جال کٹا ہرن یہ جا وہ جا۔ شکاری دیکھتے ہی رہ گئے۔ چوہا بھاگ کر بل میں جا گھسا۔ کوا درخت پر جا بیٹھا بے چارہ کچھوا آہستہ آہستہ پانی کی طرف جانے لگا۔ شکاری کو شکار ہاتھ سے نکلنے کا بہت افسوس ہوا۔ اِس کو اور تو کچھ نہ سوجھا کچھوے کو ہی اٹھاکر جھولی میں ڈال لیا۔ اب پھر باقی دوست فکر مند ہوتے کہ اپنے اِس دوست کو شکاریوں سے کیسے چھڑایا جائے۔ آخر اُن کے دماغ میں ترکیب آ ہی گئی۔ ہرن لنگڑا بنا اور لنگڑا، لنگڑا کر چلنے لگا۔ کوا اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ جیسے ہرن زخمی ہو۔ جب شکاری نے ہرن کو یوں اپنے سامنے زخمی دیکھا تو وہ خوشی سے لپکا۔ جلدی سے جھولی چھوڑی کچھوے کو زمین پر ڈالا اور خود ہرن کی طرف بھاگا ادھر کچھوا دھیرے دھیرے چلتے چلتے پانی میں چلا گیا۔ جب شکاری ہرن کے پاس پہنچا تو ہرن نے ٹانگ سیدھی کی اور وہ چوکڑی بھری کہ دو منٹ میں اوجھل ہوگیا۔ کوا درخت پہ جا بیٹھا۔ اس طرح چاروں دوست شکاری سے بچ گئے اور ہنسی خوشی اِس جنگل میں رہنے لگے۔

کنول کی شہزادی

محمود عالم
کراچی



برسات کی راتوں میں جب کبھی آپ لیمپ روشن کرکے پڑھنے بیٹھتے ہیں تو آپ کے لیمپ کے گرد بہت سے پروانے جمع ہوجاتے ہیں اور جل بھن کر خاک ہوجاتے ہیں۔ تو آپ دل میں سوچتے ہوں گے کہ یہ کتنے نادان ہیں۔ اپنے ساتھیوں کو جلتے بھنتے دیکھ کر بھی نہیں

مانتے۔ جاپان کے لوگ ان پروانوں کے متعلق ایک عجیب وغریب قصّہ بیان کرتے ہیں۔

بہت دنوں کی بات ہے کسی جھیل کی سطح پر ایک کنول کا خوب صورت پھول تیرا کرتا تھا۔ اس میں ایک ننھی منی شہزادی رہتی تھی۔ اس شہزادی کے سر پر نیلم کا ایک ننھا سا تاج تھا اور اس کے پر تتلیوں کی طرح رنگ برنگے تھے۔ دن بھر کنول اس شہزادی کو جھیل کی سیر کراتا رہتا۔ رات کو جب شہزادی اس کی نازک اور ملائم پتیوں میں سو رہتی۔ تو وہ خوشی سے جھومنے لگتا اور شہزادی کو جھولا جھلاتا۔ ایک دن شہزادی اپنے کنول میں بیٹھی جھیل کی سیر کر رہی تھی کہ اتنے میں پروانوں کا ایک غول ادھر سے گزرا وہ اتنی خوب صورت شہزادی کو دیکھ کر وہیں رک گئے۔ اب وہ سب اس کے ساتھ رہنے لگے اور کنول کے گرد چکر لگاتے اس کی تعریف کرتے اور اس کے حسن میں قصیدے کہتے ہیں۔ اس کے کنول کے گھر کو سراہتے آخر التجا کرتے اے کنول کی شہزادی تو ہم سے شادی کرلے۔

ایک دن شام کے وقت جب پروانوں کی التجا حد سے بڑھ گئی تو اس نے تمام پروانوں سے کہا، ”اے میری محبت کا دم بھرنے والو رات کے وقت میرے کنول کے گھر میں اندھیرا رہتا ہے۔ میں ڈرتی ہوں۔ جاؤ میرے لیے روشنی لاؤ تب میں جانوں گی کہ تم مجھے سچے دل سے چاہتے ہو۔ ہاں جو بھی سب سے پہلے روشنی لے آیا میں اسی سے شادی کروں گی۔“ یہ سن کر خوشی کے مارے پروانوں کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ وہ سب اسی وقت روانہ ہوگئے روشنی کی تلاش میں

رات بھر پروانے چاروں طرف اندھیرے میں بھٹکتے پھرے آخر ایک مکان میں ان کو روشنی مل گئی جھٹ اُڑ کر اندر پہنچے دیکھا مکان میں ایک شمع جل رہی ہے۔ محبت کے جوش میں ایک پروانے نے شمع کو اٹھانا چاہا تو جیسے ہی وہ اس کے قریب گیا جل کر راکھ ہوگیا۔ اس کے بعد دوسرا پھر تیسرا اس طرح سینکڑوں پروانے شمع کی لو کے پاس گئے اور ڈھیر ہوگئے، لیکن شہزادی کے لیے کوئی روشنی نہ لے جاسکا

اب شہزادی کا حال سُنیے وہ کنول کے گھر میں بیٹھی روشنی کا انتظار کر رہی تھی۔ ادھر سے ایک جگنو گزرا اس کے پروں میں ایسی نورانی روشنی تھی کہ کنول جگمگ جگمگ کرنے لگا۔ اسی رات کنول میں شہزادی اور جگنو کی شادی ہوگئی۔ ادھر غریب پروانے وفا کے پتلوں کو یہ معلوم نہیں کہ شہزادی نے شادی کر لی ہے۔ وہ کنول کی شہزادی کا حکم بجا لانے میں اس قدر مصروف ہیں کہ انھیں کسی بات کا ہوش نہیں ہے۔

بوڑھی عورت اور اس کی گائے

محمد طارق منہاس۔ قلعہ دیدار سنگھ



ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بوڑھی عورت گائے کو فروخت کرنے مارکیٹ لے جا رہی تھی۔ راستے میں ندی بہتی تھی۔ جب گائے اور بوڑھی عورت ندی کے قریب پہنچیں تو گائے ندی پار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بوڑھی عورت کو بہت غصہ آیا اور بوڑھی عورت اکیلی سڑک پر چلنے لگی۔ چلتے چلتے راستے میں اس نے ایک کتا دیکھا۔ کتے سے کہنے لگی، "تو میری گائے کو کاٹ، کیوں کہ میری گائے ندی پار کرنا نہیں چاہتی"۔ کتے نے کہا، "نہیں میں ایسا نہیں کروں گا"۔

بوڑھی عورت بہت ناراض ہوئی اور پھر سڑک پر چلنے لگی۔ تو اسے ایک چھڑی دکھائی دی۔ بوڑھی عورت نے چھڑی سے کہا، اے چھڑی تو کتے کو مار اور کتا میری گائے کو کاٹے گا، پھر میری گائے ندی پار کرے گی۔ میں گائے کو فروخت کرنے مارکیٹ لے جا رہی ہوں"۔ چھڑی نے بھی انکار کر دیا اور کہا کہ "میں ایسا نہیں کر سکتی"۔ بوڑھی عورت یہ جواب سن کر بہت ناراض ہوئی اور پھر سڑک پر چلنا شروع کر دیا۔

بوڑھی عورت کی نظر زمین پر سفید چیونٹیوں پر پڑی۔ اور ان سے کہا۔ "اے سفید چیونٹیو!، تم چھڑی کو کھاؤ اور چھڑی کتے کو مارے گی اور کتا میری گائے کو کاٹے گا، پھر میری

گائے ندی پار کرے گی اور آج میں گائے کو فروخت کرنے مارکیٹ لے جا رہی ہوں۔" سفید چیونٹیاں بولیں، "ہم ایسا نہیں کر سکتے۔" بوڑھی عورت یہ جواب سن کر بہت ناراض ہوئی اور بوڑھی عورت نے سڑک پر چلنا شروع کر دیا۔ اب بوڑھی عورت نے ایک مرغی دیکھی اور مرغی سے بولی، "پیاری میری مرغی! تم سفید چیونٹیوں کو کھاؤ اور سفید چیونٹیاں پھر چھڑی کو کھائیں گی اور چھڑی کتے کو مارے گی، پھر میری گائے ندی پار کرے گی۔ میں گائے کو فروخت کرنے مارکیٹ لے جا رہی ہوں۔" مرغی نے بھی انکار کر دیا بوڑھی عورت کو بہت غصہ آیا۔ اب آگے چل پڑی۔ اب اسے ایک سانپ ملا بوڑھی عورت نے سانپ سے کہا کہ "تو میرا ایک کام کر۔" سانپ نے کہا، "کون سا کام؟"

بوڑھی عورت بولی، "تم مرغی کو پکڑو مرغی سفید چیونٹیوں کو کھانا نہیں چاہتی اور سفید چیونٹیاں چھڑی کو کھانا نہیں چاہتیں اور چھڑی کتے کو مارنا نہیں چاہتی اور کتا میری گائے کو کاٹنا نہیں چاہتا اور میری گائے ندی پار کرنا نہیں چاہتی آج میں گائے فروخت کرنے مارکیٹ ٹھیک وقت پر نہیں پہنچ سکوں گی۔"

سانپ نے تمام بات خاموشی سے سنی اور بوڑھی عورت سے کہنے لگا کہ "میں ایسا کروں گا، جس طرح تم کہتی ہو، مجھے منظور ہے۔" سانپ نے کہا، "مجھے اس جگہ لے چلو جہاں مرغی ہے، پھر سانپ بوڑھی عورت کے ہمراہ مرغی والی جگہ جا پہنچا۔ سانپ مرغی پر حملہ کرنے لگا۔ مرغی بھاگ گئی اور مرغی نے سفید چیونٹیوں پر حملہ کر دیا سفید چیونٹیوں نے چھڑی کو کھانا شروع کیا۔ چھڑی نے فوراً کتے کو مارنا چاہا اور کتے نے گائے کو کاٹنا چاہا گائے نے فوراً ندی پار کرلی اور بوڑھی عورت گائے کو لے کر ٹھیک وقت پر مارکیٹ پہنچ گئی۔

سپاہی: (ایک شخص سے) تم اس سائیکل کے تالے کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟

شخص: جناب مجھ کو ایک چابی ملی ہے میں چاہتا ہوں کہ یہ جس سائیکل کو لگ جائے اس کے مالک کو دے دوں۔

---★---

تمھارا خیال ہے



تجویز سے اتفاق

واقعی ہر ماہ ہمدرد نونہال خاص نمبر سے کم نہیں ہوتا۔ مئی کا ہمدرد نونہال پڑھا دل بہت خوش ہوا۔ اتنا اچھا ٹائٹل، اتنے اچھے مضمون، کہانیاں سب ہی اچھّی تھیں، خاص طور پر محترمہ وحیدہ نسیم کی "روٹھی ہوئی ہے منی" بہت پسند آئی۔

میری طرف سے اتنا اچھّا پیارا پیارا اور خوب صورت رسالہ شائع کرنے پر دلی مبارک قبول فرمائیں۔

کرامت علی - لائل پور

نونہال کی ترقی

مئی کا رسالہ ملا۔ ٹائٹل بہت اچھّا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ معلوماتی مضامین میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر معلوماتی مضامین میں اسی طرح اضافہ ہوتا گیا تو انشاء اللہ نونہال رسالہ، بڑوں کو بھی نونہال بنا دے گا۔

رسالہ میں لطائف اور مصنّفین و حلقۂ دوستی کے غنچوں کے فوٹو دیا کریں۔

رسالہ میں اعلان کر دیں کہ طلبہ و طالبات معلومات کو بڑھانے کے لیے

سوالات ارسال کریں اور جواب موصول کرکے اپنے مستقبل کو بہتر بنائیں۔ معمّے دینے چاہئیں۔ تاکہ طلبہ کی کوششوں میں اضافہ ہوجائے۔

محمد اقبال میلسی

ٹائیٹل اچھا نہیں تھا

مئی کا ہمدرد نونہال پڑھا، سب کہانیاں بہت پسند آئیں۔ آپ اس رسالہ کو اور اچھا بنانے کی کوشش کریں۔ ٹائیٹل پسند نہیں آیا۔ باقی رسالہ قابل تعریف تھا۔ ہماری سب کی دعا ہے کہ خدا ہمدرد نونہال کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائیں۔

فریدہ مقصود۔ لائل پور

لاجواب رسالہ

میں عرصے سے "ہمدرد نونہال" کا مطالعہ کررہا ہوں۔ یہ بہت دلچسپ اور لاجواب رسالہ ہے۔ میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ اس جیسا بچوں کا رسالہ پورے پاکستان میں کہیں نہیں نکلتا۔ خدا اس رسالے کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی دے۔ اپریل کا پرچہ پڑھا۔ تمام مضامین قابل تعریف ہیں اور نظموں میں محشر بدایونی کی "ٹیلیفون" پسند آئی۔

محمد حنیف بیگ۔ ملتان

بزرگوں کے حالات

مئی کا ہمدرد نونہال پڑھنے کا اتفاق ہوا، اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے رسالے نے چند ماہ میں قابل رشک ترقی کی ہے۔ اس کا سہرا آپ کے سر ہے۔ میری طرف سے آپ مبارک باد قبول فرمائیں۔ ویسے تو اس میں سب چیزیں ہیں، لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اس رسالے میں پیغمبروں اور بزرگوں کے مختصر سے حالات بھی شامل کریں۔ خدا اس پیارے پیارے رسالے کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی دے۔

سید انصار حسین زیدی۔ سکھر

دلی خواہش

مئی کا شمارہ ملا۔ ٹائیٹل بھی اچھا تھا کہانیاں سب سے اچھی تھیں۔ خدا کے لیے سالنامہ نکال دیجیے تاکہ میری دلی خواہش پوری ہوجائے۔ انشاء اللہ عنقریب ہمدرد نونہال پاکستان میں اتنا مقبول ہوجائے گا کہ شاید ہی کوئی ہوا ہو۔

خدا ہمارے نونہال کو دن دوگنی، رات چوگنی ترقی دے۔ آمین۔

خالد پرویز احمدی۔ کراچی

سائنسی مضامین

مئی کا شمارا کھول کر دیکھا تو دل باغ باغ ہوگیا۔ دل چاہتا تھا کہ ابھی وقت بیٹھ کر سارے کا سارا ختم کر ڈالوں، لیکن جلد ہی یہ خیال ملتوی کرنا پڑا۔ کیوں کہ امتحان ہو رہا ہے اور اس دوران ہمیں اپنے کو اس کی طرف توجہ دینی پڑتی ہے۔ خدا ہمارے اس پیارے رسالے کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ میرا ایک مشورہ یہ ہے کہ آپ سرورق پر جو سائنس کے متعلق معلوماتی چیزیں چھاپا کرتے تھے۔ اس سلسلے کو جاری رکھیں، کیوں کہ مجھے سائنس سے بڑی دل چسپی ہے اور امید ہے کہ امتحان کے بعد میں بھی اپنے پیارے رسالے کے لیے کچھ وقت نکال سکوں۔

سید محمود باتور۔ پشاور

باغ باغ

مئی کا شمارہ ملا سرورق دیکھتے ہی دل باغ باغ ہوگیا اور بے اختیار خیال آیا کہ ہمارا پیارا پیارا رسالہ پاکستان کا بہترین رسالہ ہے آپ کی محنتوں کو نہ سراہنا ہماری نادانی ہوگی۔ میری طرف سے مبارک باد قبول فرمایئے۔ بھائی جان ہمدرد نونہال کا سالنامہ ضرور نکالیے، تاکہ تمام خوبیاں ایک رسالے میں جمع ہوسکیں۔ ہماری سب کی دعا ہے کہ خدا کرے یہ رسالہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے۔

لبنا پروین۔ راہوالی

سائنسی اصطلاحات

میں کافی عرصے سے نونہال کا مطالعہ مسلسل کر رہا ہوں اور میں نے اسے سب کے لیے بہت مفید پایا ہے۔ اس دفعہ بھی مجموعی طور سے سارے ہی مضامین عمدہ تھے۔ مجھے خاص طور سے سائنسی اور معلوماتی مضامین بہت پسند ہیں، جو اس پرچہ میں ضرور شامل ہوتے ہیں۔ علی ناصر زیدی صاحب کا ایک نہ ایک مضمون ہر اشاعت میں شامل ہونا چاہیے۔ حکیم محمد سعید صاحب کی نصیحتیں بہت عمدہ اور قابل عمل ہوتی ہیں۔ عربی اسباق کا

سلسلہ نئے سرے سے شروع کر دیا جائے تو بہت اچھا ہو۔ اگر ایک صفحہ میں مختلف سائنسی اصطلاحات کے اردو مترادفات شائع کر دیا کریں تو ہم سائنس کے طالب علموں کو اس سے بہت مدد ملے گی۔ اللہ تعالیٰ اس پرچہ کو دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ اگر سفید کاغذ استعمال کریں تو پرچے کی خوبیوں میں مزید حسن پیدا ہو جائے گا۔

محمد ارشاد حسین صدیقی۔ حیدر آباد

سالنامہ

ماہِ اپریل ۱۹۶۵ء کا ہمدرد نونہال پڑھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، پڑھ کر اتنا مزہ آیا کہ بس کچھ نہ پوچھیے اور دل سے یہ دعا نکلنی شروع ہو گئی اے خدایا! ہمارے اس پیارے رسالے کو اتنا اچھا کر دے کہ ایک رسالہ پہلے سے کئی گنا اچھا ہو۔ ہمارے ایڈیٹر صاحب کو بھی یہ توفیق دے کہ وہ اس رسالے کو بہتر سے بہتر بنانے میں کوشاں رہیں۔ اس ماہ کا ٹائیٹل کافی اچھا تھا رسالے میں معلوماتی مضامین کا اضافہ کر دینے سے رسالے کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

اس بار کہانیوں میں "استاد کی خدمت"، "چالاک درزی"، "شیر ہار گیا" اور "بلی بھوت اور الو" بہت پسند آئیں۔ نظم "علم" بھی قابل تعریف ہے۔ کیا بات ہے آپ نظمیں زیادہ کیوں نہیں شائع کرتے۔ اب آپ کون سی تصویری کہانی شائع کریں گے۔ بعض پڑھنے والوں نے آپ کو سالنامہ نکالنے کی صلاح دی ہے۔ میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ ہماری دُعا ہے کہ ہمارا پیارا ساتھی دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے تاکہ نونہال بچے اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔

نسیم سیّد۔ جڑانوالہ

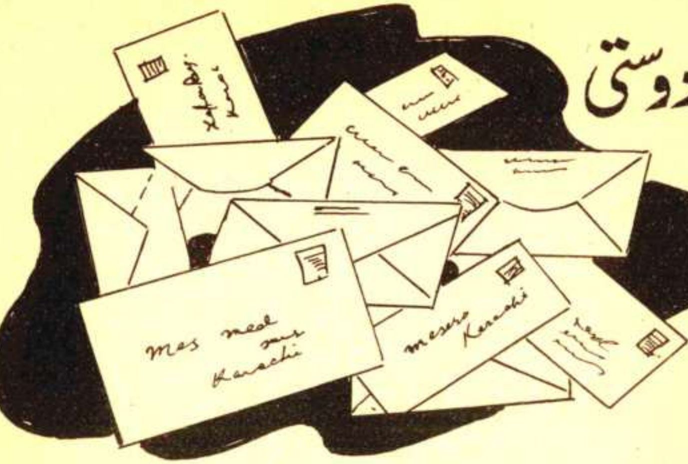
میری پسند

مجھے اپریل کا رسالہ پسند آیا۔ جس میں شاندار خوبیاں تھیں۔ دیکھ کر دل خوش ہو گیا دل چاہتا ہے کہ ہمارا رسالہ اور ترقی کرے۔

ارشد زماں۔ کراچی

★

حلقۂ دوستی



محمد افضل ——— لائلپور
عمر: ۱۲ سال تعلیم: چھٹی جماعت
دل چسپیاں: قرآن پاک کی تلاوت کرنا۔
پتہ: ہرچرن پورہ ۱ گلی ۵ مکان P.156
لائل پور

محمد ارشاد حسین صدیقی ——— حیدرآباد
عمر: ۱۸ سال تعلیم: چھٹی جماعت
دل چسپیاں: مطالعہ کتب، قلمی دوستی
پتہ: سی - ۷ / ۱۷۹۔ لطیف آباد۔ حیدرآباد

تجمل حسین ——— لائل پور
عمر: ۱۷ سال تعلیم: پرائیویٹ
دل چسپیاں: ہمدرد نونہال کا مطالعہ کرنا
پتہ: کوارٹر ۱۲۹۲ ڈی ٹائپ کالونی
لائل پور

ظہور الدین گل ——— ڈیرہ غازی خان
عمر: ۱۷ سال تعلیم: میٹرک (جاری)
دل چسپیاں: قلمی دوستی، ٹکٹ جمع کرنا
پتہ: مکان نمبر ۴۵۔ بلاک این۔ ڈیرہ غازی خان

محمد عظیم بٹ ——— لاہور
عمر: ۱۴ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: کرکٹ کھیلنا، ٹکٹ جمع کرنا۔
پتہ: مکان نمبر ۱ مہابھارت اسٹریٹ
۴۳ ریلوے روڈ۔ لاہور

خورشید اختر ——— لائل پور
عمر: ۱۶ سال تعلیم: پنجم
دل چسپیاں: جانوروں سے پیار۔
پتہ: معرفت صوفی نیاز علی دفعیدار سب ڈویژن اکبانہ لائل پور کینال آفس لائل پور

مجاہد محمد خاں ——— گوجرانوالہ
عمر: ۱۲ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا۔ فوٹوگرافی
پتہ: معرفت فاروق محمد خاں سی ڈی او شوگر ملز راہوالی ضلع گوجرانوالہ (مغربی پاکستان)

چودھری محمد اسحاق ——— لائل پور
عمر: ۲۱ سال تعلیم: میٹرک
دل چسپیاں: اسلامی کتب کا مطالعہ کرنا
پتہ: معرفت صوفی نیاز علی دفعیدار سب ڈویژن اکبانہ لائل پور

حامد رضا خاں ——— پرانا سکھر
عمر: ۱۷ سال تعلیم: میٹرک
دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا۔ شعروشاعری
دوبی کوارٹر نصرت کالونی۔ پرانا سکھر

شبیر احمد ——— سیال کوٹ
عمر: ۱۴ سال تعلیم: نہم کلاس
پتہ: معرفت محمد سعید دوکاندار اردو بازار شہر سیال کوٹ

اوصاف احمد قریشی ——— بہاول پور
عمر: ۱۳ سال تعلیم: ہفتم
دل چسپیاں: ہمدرد نونہال پڑھنا۔
پتہ: معرفت انوار احمد قریشی۔ اے ایس۔ ایم۔ ریلوے اسٹیشن۔ سمہ سٹہ ضلع بہاول پور

محمد عرفان گلنام ——— کیمبل پور
عمر: ۱۸ سال تعلیم: فسٹ ایئر
دل چسپیاں: مصوری۔ قلمی دوستی
پتہ: اٹک آئل کمپنی، کھوڑ ضلع کیمبل پور ڈاک خانہ۔ خاص کھوڑ۔

تاج محمد تاج قریشی ——— روہڑی
عمر: ۱۴ سال۔ تعلیم: آٹھویں
دل چسپیاں: بزرگوں کی خدمت کرنا
پتہ: معرفت غلام محمد محلہ ٹکر مختیار کار گلی مکان اے/۱۵۳۸۔ روہڑی۔

سید کرامت حسین کاظمی ——— گجرات
عمر: ۱۸ سال تعلیم: مڈل
دل چسپیاں: رسالوں کا مطالعہ کرنا
پتہ: موضع جھولانہ۔ تحصیل پھالیہ۔ براستہ منڈی بہاؤالدین۔ ضلع گجرات

ہاشم بیگ ــــــ میرپور خاص
عمر: ۱۴ سال۔ تعلیم: نہم
دل چسپیاں: کرکٹ کھیلنا۔
پتہ: میونسپل گڈس ناکہ میرپور خاص

اسرار احمد ــــــ بہاول پور
عمر: ۱۸ سال۔ تعلیم: نہم
دل چسپیاں: ہمدرد نونہال پڑھنا
پتہ: ریلوے ہائی اسکول سمرسٹہ ضلع بہاول پور

محمود رضا ــــــ کھلنا
عمر: ۱۳ سال۔ تعلیم: درجہ نہم
دل چسپیاں: کہانی کی کتابیں پڑھنا
پتہ: محمود رضا کمپنی۔ احمد رضا برادرز ممتاز اسٹور کھلنا۔ (مشرقی پاکستان)

جاوید اقبال بھٹی ــــــ سرگودھا
عمر: ۱۶ سال۔ تعلیم: فرسٹ ایر
دل چسپیاں: ٹکٹ۔ سکے اکٹھے کرنا
پتہ: ۲۱۔ بی اسلام پورہ۔ سرگودھا

مجاہدہ بانو ــــــ گوجرانوالہ
عمر: ۱۳ سال۔ تعلیم: نہم
دل چسپیاں: نونہال پڑھنا۔
پتہ: معرفت فاروق محمد خاں۔ سی ڈی۔ او شوگر ملز راہوالی ضلع گوجرانوالہ (مغربی پاک)

منیر پرویز ــــــ سرگودھا
عمر: ۱۵ سال۔ تعلیم: میٹرک
دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ تحائف
پتہ: بلاک نمبر ایچلروان۔ ضلع سرگودھا

خالد الٰہی ــــــ کراچی
عمر: ۱۰ سال۔ تعلیم: چھٹی جماعت
دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا۔
پتہ: ۸۵۔ فلن اسٹریٹ۔ گارڈن ایسٹ۔ کراچی۔ ۳

محبوب احمد (فخر) ــــــ جہلم
عمر: ۱۵ ½ سال۔ تعلیم: میٹرک
دل چسپیاں: ہمدرد نونہال کا مطالعہ کرنا
پتہ: نکی وجگیسی ڈاک خانہ دینہ تحصیل و ضلع جہلم۔

اظہر سہیل شاہ ــــــ شیخوپورہ
عمر: ۱۲ سال۔ تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: سائیکل چلانا۔ مطالعہ کرنا
پتہ: معرفت سید طفیل حسین شاہ۔ محلہ جہانگیر آباد۔ قلعہ شیخوپورہ

عبدالرزاق ــــــ کراچی
عمر: ۱۲ سال۔ تعلیم: ساتویں جماعت
دل چسپیاں: رسالہ پڑھنا۔
پتہ: رزاق بک ڈپو۔ فریر اسٹریٹ۔ صدر کراچی

آر اے شہزاد پنجابی ——— حیدر آباد
عمر: ۱۳ سال۔ تعلیم: جماعت پنجم
دل چسپیاں: رسالے پڑھنا۔
پتہ: نور محمد ہائی اسکول۔ حیدر آباد

سلیم الحق ——— کراچی
عمر: ۱۷ سال۔ تعلیم: انٹر سائنس
دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ شعر و شاعری
پتہ: ۱۶۵-اکرم مکرم منزل۔ مسجد روڈ
بہار کالونی۔ کراچی ۲

ریاض احمد شہزاد ——— لاہور
عمر: ۱۳ سال۔ تعلیم: پنجم
دل چسپیاں: ہمدرد نونہال پڑھنا
پتہ: ایم۔ این۔ اسکول۔ شاہی مسجد۔ لاہور

محمود احمد بیگ ——— کراچی
عمر: ۱۲ سال۔ تعلیم ہشتم
دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا۔
پتہ: آئی۔ بی ۸/۵۔ ناظم آباد۔ کراچی

مسٹر محمد نثار ——— لاہور
عمر: ۱۶ سال۔ تعلیم: میٹرک
دل چسپیاں: خط کا جواب فوراً دینا
پتہ: واحد مشنیری اسٹور نمبر ۹۰ ریلوے روڈ
نور اسٹریٹ۔ لاہور

شہناز سلطانہ ——— آدم جی نگر
عمر: ۸ سال۔ تعلیم: جماعت پنجم
دل چسپیاں: ٹکٹ جمع کرنا۔
پتہ: معرفت حفیظ الدین ۶۔ آدم جی
جوٹ مل۔ آدم جی نگر مشرقی پاکستان

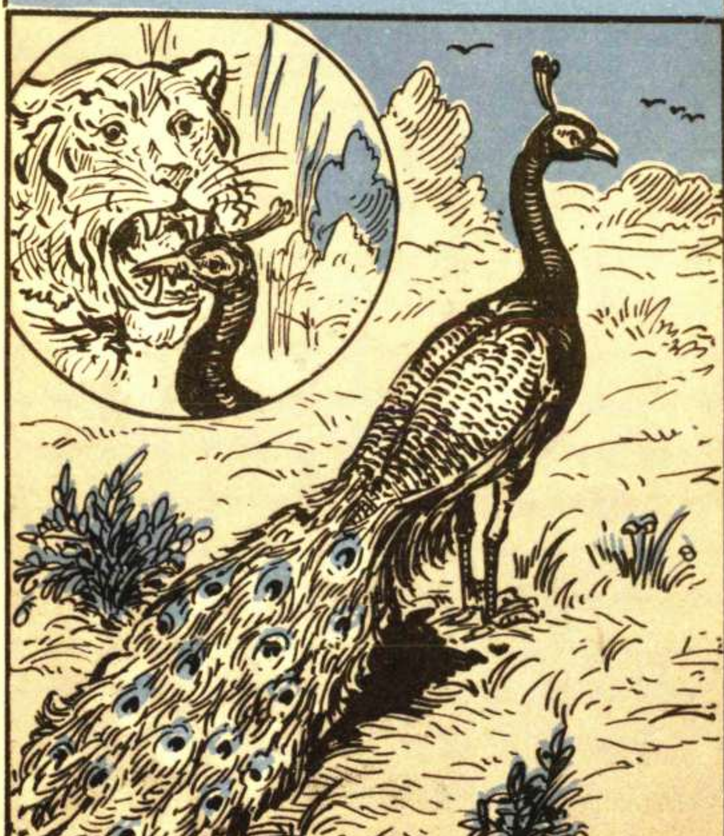
فارم حلقۂ دوستی

نام: ---------------------
عمر: ---------------------
تعلیم: ---------------------
دل چسپیاں: ---------------------
پتہ: ---------------------

اُن الفاظ کے معنی کیا ہیں؟

آشیاں: گھونسلہ، آدمیوں کا رہنے کا مکان۔
آہ وزاری: رونا، پیٹنا
الاؤ: شعلہ دیتی ہوئی آگ
اِلتجا: آرزو
پری زاد: پری کا بچّہ، خوب صُورت
تُرکی بہ تُرکی: جیسا کوئی کہے، ویسا ہی
خانقاہ: درویشوں کے رہنے کی جگہ
خول: کھوکھلا، اوپر کا غلاف
دلاسا: تسلّی
دل خراش: دردناک
دُہائی: فریاد، امن چاہنا
دید: دیکھنا
رام کرنا: فرماں بردار کرنا، راضی کرنا
رونما: ظاہر ہونا
زود اثر: جلدی اثر کرنے والا یا کرنے والی چیز
سَاز: گھوڑے کی لگام، کاٹھی وغیرہ
سجیلا: بنا ٹھنا،
سماں: وقت، زمانہ، دور، موقع محل
سنگم: دو چیزوں کا میل
سوغات: تحفہ، انوکھی چیز
سیّاح: سفر کرنے والا
صید: شکار
عندلیب: بلبل
عیار: چالاک، ہوشیار
قفس: پنجرا، جال، پھندا
کامنی: نازک اور دبلی عورت
گلہ: شکایت
گھمنڈ: تکبّر، غرور
لنڈورے: وہ پرندے جن کی دم نہ ہو، بے یارومددگار
مجروح: زخمی
مشتعل: بھڑکتا ہوا، بہت ہی غصے میں
معجزہ: وہ کام جو انسانی طاقت سے باہر ہو۔
مغموم: غم زدہ، رنجیدہ
منت سماجت: خوشامد، گزارش
نظارہ: تماشا، سیر
نمودار: ظاہر ہونا، سامنے آنا

موتیوں کا صندوق



ب



لومڑی کے دماغ میں ہر وقت بونی خرگوش کا خیال رہتا تھا، دونوں کی آپس میں چھیڑ چھاڑ چلتی تھی۔ لومڑی سے جنگل کا بادشاہ شیر ببر، مشورے لیا کرتا تھا، اس لیے اس کا دماغ اونچا ہوگیا تھا اور وہ ہمیشہ بونی کو نیچا دکھانے کی فکر میں رہتی تھی۔



شیر کے دانتوں میں درد ہوگیا۔ ڈاکٹر مور نے اس کے
دانت صاف کیے، مگر درد دُور نہ ہوا اور شیر دھاڑنے لگا۔
لومڑی نے آواز سنی تو شیر کے محل کی طرف دوڑی کہ شیر اس سے
مشورہ کرے گا۔



شیر لومڑی کو دیکھتے ہی غصّے سے بولا، میرے علاج
کے لیے تم نے کچھ سوچا؟ لومڑی نے کہا، حضور، اگر موتیوں
کا صندوق سمندر سے نکل آئے تو کام بن جائے۔ مجھے خود
تو تیرنا آتا نہیں، کسی غوطہ خور کی تلاش میں پھر رہی ہوں۔



بونی خرگوش بھی بادشاہ کا مزاج پوچھنے آیا تھا، لومڑی نے بونی کو الگ لے جاکر پوچھا کہ کیا اُس کو تیرنا آتا ہے؟ بونی نے کہا کہ تیرنا کیا، میں تو بہت اچّھا غوطہ خور ہوں، کئی بار سمندر سے موتی نکال کر لایا ہوں۔



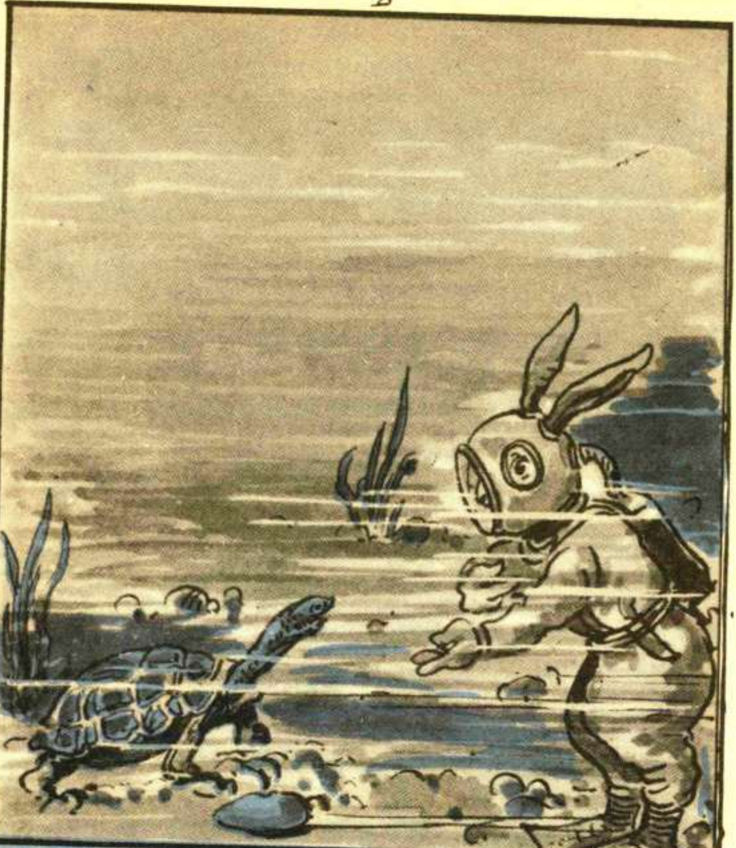
لومڑی شیر کے پاس گئی اور اس کو بونی کے متعلق بتایا۔
شیر نے گرج کر کہا کہ دیکھو بونی، جلدی کرو، موتیوں کا صندوق
لے آؤ تو ہم تمھیں کافی انعام دیں گے۔



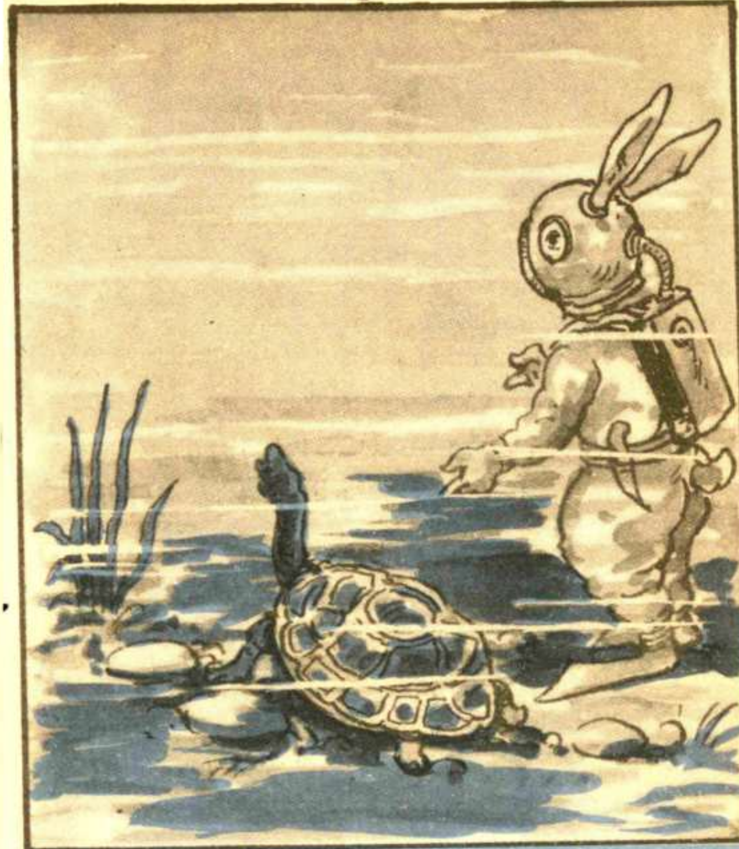
بونی جلدی سے اپنے گھر گیا، وہاں اس نے شیشہ لگی ہوئی ٹوپی پہنی، جس میں ہوا کے لیے ایک نلکی لگی ہوئی تھی۔ پیروں میں ربڑ کے جوتے اور واٹر پروف کوٹ، پتلون پہن کر سمندر پہنچا اور چھلانگ لگادی۔



بونی نے بیچ سمندر میں پہنچ کر غوطہ لگایا۔ سمندر میں
اسے وھیل مچھلی اور آکٹوپس ملے۔ بونی دونوں سے
ڈرا۔ دونوں اس کے لیے خطرناک تھے۔ ان کے ہاتھ آجاتا
تو اس کو ہڑپ کر جاتے، اس لیے وہ ان سے بچتا ہوا گہرے
پانی میں چلا گیا۔



سمندر کی تہ میں بونی کا دوست کچھوا ملا، مگر وہ
بونی سے ڈر کر بھاگا۔ بونی نے آواز دے کر بتایا کہ میں
تمھارا دوست ہوں، غوطہ خور کا لباس پہن کر آیا ہوں۔
تب کچھوا رکا اور اس کی خیریت دریافت کرنے لگا۔



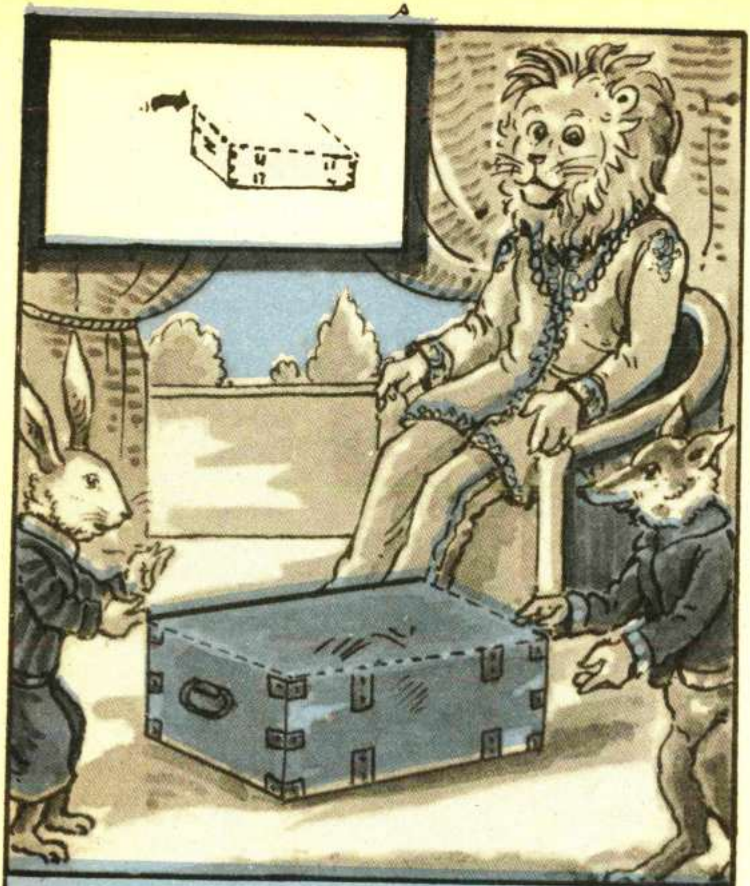
بونی نے کچھوے کو سارا حال کہہ سنایا۔ کچھوے نے
کہا، فکر کی بات نہیں ہے، وہ دیکھو سامنے سمندری گھاس
کے پاس موتیوں کا صندوق پڑا ہے۔ کسی سوداگر کے جہاز
سے گر پڑا تھا۔ ہمارے کس کام کا۔



بونی خوش ہو کر جلدی سے صندوق کے پاس پہنچا
اور دونوں ہاتھوں سے پکڑ تیرتا ہوا سمندر کے کنارے
اسی جگہ خیریت سے پہنچ گیا، جہاں سے غوطہ لگایا تھا۔



کنارے پر ہاتھی، لومڑی اور بونی کی بیوی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ لومڑی صندوق کو اپنے قبضہ میں کرنا چاہتی تھی، مگر بونی نے صندوق اپنی بیوی کو دے کر لومڑی سے کہا کہ ہاتھی پر سوار ہو کر جلدی سے شیر بادشاہ کے پاس چلو۔



شیر بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا اور درد
سے تڑپ رہا تھا۔ لومڑی نے صندوق کھولا ، اندر سے
ایک ڈبہ اور ایک کاغذ نکلا۔ بونی نے وہ کاغذ پڑھا
اور بادشاہ سے کہاکہ آپ دانتوں میں یہ منجن ملیے۔



شیر بادشاہ نے جلدی سے اپنے دانتوں پر منجن ملا۔ ذرا سی دیر میں اسے آرام آگیا۔ بادشاہ نے بونی کی سمجھ اور محنت کی داد دی اور کہا کہ واقعی یہ موتیوں سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ بونی کی تعریف سے لومڑی دل ہی دل میں جلنے لگی۔



بونی نے کہا، حضور، یہ ہمدرد منجن ہے۔ دانتوں کی
صحت و صفائی کے لیے اس سے اچھا کوئی منجن نہیں ہے۔
اس سے منھ کی بدبو دور ہوتی ہے اور دانت موتیوں کی طرح
چمک اٹھتے ہیں۔ آپ ہمیشہ ہمدرد منجن استعمال کیا کیجیے۔
شیر نے خوش ہوکر بونی کو اپنا نائب بنالیا۔



جولائی ۱۹۶۵ء

رجسٹرڈ ایس نمبر ۱۹۰۳

ہمدرد
نونہال

ساتواں شمارہ

بارھویں جلد

اس رسالے میں کیا ہے؟

قیمت : ایک رسالہ ۷۵ پیسے —— سالانہ آٹھ رُپے